وہ خاتون دو تین بار آئیں اور میں نے ان کو دلاسا دیا کہ ہم لوگ اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ مگر صدر یحییٰ خان کو اس کی خبر ہوگئی۔ ان خاتون نے ان سے کہا ہوگا کہ ان کا منصوبہ آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اپنے پرنسپل سیکریٹری سے منصوبے کے بارے میں معلومات کے لیے کہا۔ میں نے ان کو سارا قصہ کہہ سنایا اور اس بات کو دہرایا کہ بدقسمتی سے اس وقت وسائل موجود نہیں ہیں۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ عالمی بینک نے ٹیکسٹائل ملوں کے لیے قرضے جاری کرنے مکمل طور پر بند کر دیے ہیں اس لیے کہ ان کے خیال میں ملک میں ضرورت سے زیادہ ٹیکسائل ملیں لگ چکی ہیں۔ چند دنوں بعد پرنسپل سیکریٹری نے مجھے فون کیا اور اپنی سہولت کے مطابق اسلام آباد آنے کے لیے کہا۔ وہ میرے پرانے ساتھی بھی تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا، ''سعید احمد مجھے معلوم نہیں کہ تمھارے اور صدر کے درمیان کیا ہوگیا ہے، مگر انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے استعفیٰ طلب کروں۔ یہ رہا تمھارا استعفیٰ جس پر تم دستخط کردو'' میں نے جواب میں کہا، آفتاب، ہم دونوں پرانے دوست ہیں اور تمھیں معلوم ہے کہ PICIC تقریباً نجی شعبے کی ملکیت ہے، حکومت کا ادارہ نہیں۔ اگر میں استعفیٰ دینے سے انکار کردوں تو کیا ہوگا؟'' تھوڑی دیر سکوت کے بعد میرے دوست نے کہا، ''اگر تم نے اس بنا پر انکار کیا تو نہ صرف یہ کہ تم بلکہ تمھارے اہلِ خانہ بھی مصیبت میں ہوں گے۔ اس لیے مہربانی کر کے اس کاغذ پر دستخط کردو، اور میں نے چپ چاپ دستخط کر دیے۔ اس کے بعد پانچ چھ ماہ میں بے روزگار رہا۔ اس وقت میرے اچھے دوست روشن علی بھیم جی کام آئے اور انھوں نے مجھے ایسٹرن فیڈرل انشورنس میں، ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ جو میں کئی برسوں سے تھا، اضافی طور پر مالی مشیر کی حیثیت سے شامل ہونے کی پیش کش کی۔

اس واقعے کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ میں شکایتاً یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ مجھے اس قسم کی مشکلات کبھی درپیش نہیں رہیں۔ میں صرف آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ'' ہماری قوم کے پچھلے پچاس برس کیسے گزرے؟'' یہ باتیں کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی کارکردگی بُری نہیں رہی، بلا شبہ ہم اِس سے بہتر ہو سکتے تھے مگر اس قسم کے واقعات کی بنا پر، جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں، ہم زیادہ کچھ نہیں کر سکے ہیں۔''

نئی صدی کی آمد سے چند دن پہلے، جب میں نے یہ سطور لکھنی شروع کی تھیں، میں اپنے دوست سے ان کے دفتر میں ملا تھا۔ وہ اب بھی ایک نسبتاً چھوٹی بیمہ کمپنی کے چیئرمین ہیں اور اسی وقار اور نظم وضبط کے جذبے کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں جس طرح وہ زندگی بھر کرتے رہے ہیں۔ کوئی بھی ذمے داری ہو، چھوٹی ہو یا بڑی، باعزت ہو یا مشقت والی، وہ ویسی ہی سنجیدگی سے نبھاتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں ایمان داری سے کام انجام دیں۔ ان کے نزدیک ان کی ذمے داریاں، عوام اور سماج کے مفادات ہمیشہ ان کی پہلی ترجیحات رہی ہیں۔ ایسے دوست ملنا انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے جن پر مکمل اعتبار کیا جا سکے، جو اعتبار کے قلعے کے مترادف ہوتے ہیں۔

# جہانگیر صدیقی

## مالیات کے جادوگر

جب مارچ ۱۹۹۸ء میں جہانگیر صدیقی سے ان کے خوب صورتی اور پیشہ ورانہ انداز میں سجائے ہوئے دفتر میں ملاقات ہوئی جو کراچی اسٹاک ایکس چینج سے متصل ایک عمارت کی چودھویں منزل پر واقع تھا جہاں میں اُن سے اُن کے ای ایف یو سے روابط کے بارے یں بات چیت کرنے گیا تھا تو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دراصل ہم ایک دوسرے سے کافی دنوں سے واقف تھے، صرف سی وقت سے نہیں جب سے میں نے کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شمولیت اختیار کی تھی، جس کے وہ بھی رُکن تھے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا ب میں ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کے پہنچا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنا دفتر دکھایا جو واقعتاً جدید رکھ رکھاؤ اور اعلیٰ درجے کے ساز و سامان ے قابلِ فخر طریقے پر مزیّن تھا، ان دفاتر سے کہیں مختلف جن کا میں ای ایف یو کے زمانے سے عادی تھا۔ دفتر کی کشادہ کھڑکیاں ہمیں وہ ظارے دکھا رہی تھیں جن میں بے شمار مکانات، سڑکیں، گودام، سارس جیسی سامان اٹھانے والی مشینیں، بندرگاہ اور جہاز شامل تھے جس کو کراچی کہتے ہیں، پاکستان کا سب سے بڑا شہر، جس میں ڈیڑھ کروڑ افراد بستے ہیں، جو دنیا کا ایک عظیم شہر ہے، اپنے تمام تقریباً ناقابلِ حل ڑے بڑے مسائل کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔

انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کافی پسند کروں گا یا چائے، اور پھر خود اُٹھ کر لینے چلے گئے، اس لیے اس کہ وقت ان کی سیکریٹری صروف تھی۔ ان کے اطراف ایک پیشہ ورانہ خصوصیت، خود اعتمادی اور بےفکری کا ہالہ تھا جس نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ سب کچھ بالکل فطری گ رہا تھا، ان میں شمہ برابر بھی کسی قسم کا تکبّر نہیں تھا جو عموماً ایسے لوگوں کی شخصیت کو گھیر لیتا ہے جو بلندیوں پر پہنچنے کے صحیح معنوں میں دعوے رتے ہیں۔ میں مالیاتی امریکی تاجروں سے ان کے روابط سے بھی واقف تھا اور ان لوگوں سے ایسے ہی بےفکرے انداز میں ان کی معاملت ی مہارت سے بھی۔ مگر میں اس روایت کے پاسدار، بےحد محتاط سندھ نژاد کاروباری سے بھی واقف تھا جس کے بےعیب و بےمثال آداب ور جس کی ممتاز شائستگی اس کو ماضی کے کسی شاہی درباری کے گھرانے میں ایک اعلیٰ مقام کا حق دار بنا دیتے۔

ہم نے ملک کی معاشیاتی حالت پر باتیں کیں، ماضی کے جھروکوں پر بھی نظر کی اور سیاست دانوں کو اس ملک کے اس بدعنوان نگل کا بھی ذمے دار ٹھہرایا، جو اس کی تیز رفتار ترقی کی راہوں میں حائل کر دیا گیا تھا۔ اس کی تصورات سے عاری بےعمل اور کٹر افسر شاہی اور س کے کم عقل اور بےلچک رویوں کا بھی جائزہ لیا، ملک کے بہت سے نوجوان صنعتکاروں کے بارے میں بھی باتیں کیں جو صرف اپنے رمائے پر تکیہ کرتے ہیں، اپنے اثاثے اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے بھی ترقیاتی معجزے کے منتظر رہتے ہیں، اپنے آبا و اجداد سے بالکل مختلف نھوں نے پاکستان کی معیشت کی ایسی بنیاد رکھی تھی جو صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں پھولی پھلی اور بعد میں آزادی پانے والے لکوں کے ایشین ٹائیگر بننے میں نشانِ راہ بنی تھی۔

جس دم وہ پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہے وہ شخص جس پر ایک ابھرتا ہوا ملک فخر کر سکتا ہے۔ اگر اس جیسے اور بھی لوگ ہوتے تو آج ہمیں اور اس کو ماضی کی بے عملیوں اور لمحۂ موجود کے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے امکانات پر اشکباری نہ کرنی پڑتی۔

جہانگیر صدیقی ۲۷ رجولائی ۱۹۴۸ء کو حیدر آباد سندھ میں پیدا ہوئے، ایسی حقیقی پاکستانی شخصیت جو کاروبار ہو یا اور کوئی میدان، ہر جگہ اپنے نقوشِ قدم چھوڑتی نظر آتی ہے۔ اسی زمین پر جس نے ماضی کے دو ممتاز مگر متنازع فیہ وزرائے اعظم کو جنم دیا تھا۔

جہانگیر صدیقی کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی اور سندھ یونی ورسٹی سے اُنھوں نے کامرس میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد وہ چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کے لیے کراچی چلے گئے۔

میرے سوال پر کہ ایک درمیانے درجے کے خاندان کے فرد ہوتے ہوئے آپ کاروبار کی طرف کیوں آئے، جہانگیر صدیقی نے کہا، "میں ہمیشہ سے حصص کی دلالی میں دل چسپی رکھتا تھا۔ ہمارے دفتر کے سامنے جو عمارت آپ دیکھ رہے ہیں، جسے حبیب ایکس چینج بلڈنگ کہا جاتا ہے، اس میں جب میں پہلی بار ۱۹۶۷ء میں داخل ہوا تھا اس وقت یہ سیکورٹی سیف ڈپازٹ چیمبر کے نام سے موسوم تھی۔ مجھے وہ تاریخ ابھی تک یاد ہے، وہ بائیس مارچ کا دن تھا۔ میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کے لیے آرٹیکل کلرک کی حیثیت سے ایک آڈٹ کرنے والے ادارے میں بھرتی ہو گیا تھا جس کا دفتر اسی عمارت میں واقع تھا۔ میں نے اپنے طالب علمی کے دنوں میں آدمجی شوگر ملز اور میرپور خاص شوگر ملز کے حصص خریدنے کی درخواستیں دی تھیں۔ مجھے تو اس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ درخواستیں دی کس طرح جاتی ہیں اور حصص کی فروخت کیسے ہوتی ہے۔ جب میں نے کراچی میں کام شروع کیا تو اپنے ایک دوست سے کسی ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہا جو میرے حصص کو خریدنا چاہے گا۔ وہ مجھے اپنے بھائی کے پاس لے گیا جو حصص کے کاروبار میں دلالی کرتا تھا اور اس نے مجھے دو عدد ٹرانسفر ڈیڈ کے فارم دیے۔ میں بہت خوش اور متاثر ہوا اور میں نے سوال کیا کہ مجھے اس کام کے لیے کتنی رقم ادا کرنی پڑے گی۔ وہ یہ سن کر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس کام کی کوئی اجرت نہیں ہوگی بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا کہ اس قسم کے کام میں میری مدد کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہے۔ آج میں اپنے گاہکوں کو اس قسم کے کروڑوں فارم دیتا ہوں مگر اس دن مجھے واقعی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر بہت مہربانی کر رہا تھا۔ کسی اسٹاک ایکس چینج میں جانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جس نے مجھ میں ایسا جوش پیدا کر دیا کہ کھانے کے وقفے کے دوران میں ہر روز وہاں جانے لگا۔ میرا کھانے کا وقفہ ساڑھے بارہ بجے سے دو بجے تک ہوتا تھا جب کہ ایکس چینج میں کاروبار ساڑھے دس بجے سے دو بجے تک ہوتا تھا۔ میں وہاں صرف گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس طرح میری کچھ دلالوں سے دوستی ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے مجھے کچھ حصص خریدنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت میرے پاس بہت کم رقم تھی مگر میں نے وہ حصص خرید لیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری پہلی خریداری حبیب بینک کے حصص کی تھی۔ میں نے وہ حصص سولہ روپے کے حساب سے خریدے تھے۔ کچھ بائیس روپے میں، کچھ تئیس اور کچھ ستائیس روپے میں فروخت کیے تھے۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں حبیب انشورنس کے حصص اٹھائیس روپے میں خریدے اور اسّی فی صد منافع لیتے ہوئے ان کو پینتالیس اور پچاس روپے میں فروخت کیا۔ اس طرح میں نے کافی دولت کمائی۔ میں صحیح طور پر بیان کروں، اس لیے کہ اس کی پوری جزئیات مجھے ازبر ہیں، کہ ۱۹۶۷ء میں مجھے ۱۵۰۰۰ روپے کا فائدہ ہوا تھا، اور یہ بھی صرف پانچ مہینوں میں۔ یہ ہر اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی، اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ان دنوں کراچی میں بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایک فائنانس ڈائریکٹر کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ ۲۵۰۰ روپے ہوا کرتی تھی۔

جیسا کہ آپ کو اندازہ ہوگا، میں بے انتہا پُرجوش تھا اور میں نے اپنی پہلی گاڑی خرید لی تھی۔ جرمنی کی بنی ہوئی ایک Opel Rekord 1900 L، بڑی سی گاڑی۔ اس سے کہیں کم قیمت میں کوئی جاپانی گاڑی بھی خریدی جا سکتی تھی مگر میں سب سے اچھی گاڑی چاہتا تھا اور دنیا بھر میں جرمن گاڑی سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ اس گاڑی پر میں نے بتیس ہزار روپے خرچ کیے۔ اب میرا زیادہ وقت

ٹاک ایکس چینج میں گزرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنی تعلیم سے بے خبر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک اچھا طالب علم تھا اور میں نے ۱۹۶۹ء میں CA کرلیا تھا۔

اس وقت تک میں نے اپنی تمام پونجی اپنے دوست حصص کے دلال کے حوالے کر رکھی تھی جو اس وقت تک ۲۴۵۰۰ ر تک پہنچ چکی ی۔ میں یہ سب اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دنیا بھر کے بازارِ حصص میں ہر روز کیا ہوتا ہے، کاروبار کی نچ نیچ جو ایک ہی سمت میں نہیں چلتی۔ مگر میں بے انتہا خوش بھی تھا، میری نقد رقم میرے دوست دلال کے پاس، میری Opel Rekord رے گھر کے سامنے اور دس ہزار روپے نقد میری خواب گاہ کی میز کی دراز میں۔

ایک دن صبح کے وقت میرے دوست دلال نے ٹیلی فون کیا اور فوراً ملاقات کے لیے مجھے بلایا۔ میں افتاں و خیزاں اس کے پاس نچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک کرسی میں دھنسا ہوا، بے زار، بدحال، زرد اور سُتا ہو چہرہ لیے ہوئے پریشان حال بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے مجھے یا کہ اگلے دن شاید وہ خود کو دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے، اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں۔ اس لیے کہ اسے بہت سی نقد ادائیگیاں کرنی یں مگر اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ وہ بار بار کہتا رہا کہ وہ کتنی سنجیدگی سے کم از کم میری، یعنی اپنے دوست کی رقم بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور ت ممکن ہے کہ وہ بہت جلد ہی خودکشی کر لے گا اس لیے کہ اس پریشانی سے نکلنے کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میں نے اس کی دل جوئی کی بہت وشش کی اور اسے سمجھایا کہ اپنی جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں کہ اس طرح وہ کھوئی ہوئی دولت واپس حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ سب کہتے وئے بھی میں اس خوش فہمی میں تھا کہ میری رقم بچ جائے گی اور ہمت کر کے میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ اس نے میری رقم کہاں لگائی ہے؟ اہر ہے کہ اس کا جواب یہی تھا کہ سب کچھ ڈوب چکا ہے۔ میں اس وقت اس کو کسی دوسری دنیا کے آدمی کے مانند لگا ہوں گا اس لیے کہ رے دلاسے نے اس کے حواس بحال کیے اور اس نے مجھے دل جوئی کے لیے بتایا کہ اس نے کم از کم میری کچھ رقم بچانے کے لیے کچھ نظامات کر بھی لیے ہیں۔ اس نے بار بار مجھے یقین دلایا کہ اپنی پوری کوشش کرے گا کہ جتنی جلد ہو سکے وہ مجھے میری پوری رقم واپس دلا ے۔

اس کے حالات کچھ بہتر ہوئے مگر چند دنوں بعد ہی اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے اس کو اسپتال داخل کرادیا۔ کسی حد تک اس ی حالت سنبھل گئی تھی مگر وہ اس قابل نہیں ہو سکا کہ اپنا کاروبار صحیح طور پر چلا سکے۔ وہ دل کا دائمی مریض بن چکا تھا۔ اس بوجھ کے باعث جو س کے قرض خواہوں کے ہر روز دروازہ کھٹکھٹانے سے پڑ رہا تھا، اس کی حالت بہتر ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر ہم دونوں نے طے کیا کہ چھ حصص، کرنافلی جوٹ، ریان اور پیپر کے، پاکستان نیشنل شپنگ کے اور کچھ دوسرے مغربی اور مشرقی پاکستان کے، جو اس کے پاس بچ رہے، ں خرید لوں گا۔ اور اس کے پانچ دفتروں میں سے دو عدد میں نے خرید لیے۔ اس طرح اسے اپنے قرض خواہوں کے تقاضے سے بچنے میں مدد راہم کردی اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اچانک اور حادثاتی طور پر، میں خود ہی ایک اسٹاک بروکر بن گیا ہوں۔ میرے دوست نے میرے اتھ کام جاری رکھا اور اس طرح وہ اپنے خاندان کی کفالت کرنے لگا تھا۔

ماضی میں جھانک کر دیکھنے اور آپ سے بات کرنے کے دوران مجھے سب کچھ حیرت انگیز اور غیر حقیقی لگ رہا ہے۔ مگر یہ سب کچھ رے لیے اتنا اچھا ہوا جیسا کہ شاید ہی کبھی ہو سکتا۔ اگر میرے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو میں شاید کبھی اسٹاک بروکر نہیں بن سکتا۔ میں آج ھی کسی اور کے دفتر میں کام کر رہا ہوتا، شاید فائنانس ڈائریکٹر یا کسی ادارے کی چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں۔ واقعاتی کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ گر سب سے بدقسمتی کی بات ابھی ہونی باقی تھی۔ اس سب کے فوراً بعد ہی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ یہ دسمبر ۱۹۷۰ء کا قعہ ہے۔ بازار بند ہو گیا تھا، ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان ہو چکا تھا اور ہم جنگ ہار گئے تھے۔ اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میری بیشتر نجی مشرقی پاکستان کے اداروں کے حصص میں لگی ہوئی تھی جو سب ختم ہو چکے تھے اور اور میرا نقصان ہو گیا تھا۔ دس مہینے کے کام کے بعد میں

قلاش ہوگیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میرا سارا سرمایہ ڈوب چکا تھا، مجھ پر ایک قرض بھی چڑھا ہوا تھا جو میری خاندانی جائیداد کی ضمانت پر لیا گیا تھا جسے جائیداد فروخت کر کے ادا کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں مجھے نئے سرے سے کاروبار کی ابتدا کرنی تھی مگر بغیر کسی سرمائے کے۔ میرے پاس میری خوب صورت کار Opel Rekord ابھی موجود تھی مگر میں اب اس کو اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ ایندھن کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ مجھے 50cc ایک ہنڈا موٹر سائیکل پر اکتفا کرنا پڑا جسے میں اور میرے دفتر کا ایک ملازم دونوں استعمال کرتے تھے۔ موٹر سائیکل کو میں شام کو اپنے گھر لے جاتا اور صبح دفتر لے آتا اور دن بھر اس کو دفتری کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا۔ ان دنوں پٹرول چار روپے گیلن ہوتا تھا۔ مگر کاروبار اور پانچ افراد کی تنخواہ بھی دینی ہوتی تھی، بجلی کے اخراجات، اور دفتر کا کرایہ۔ جزوی طور پر بازار بند رہتا تھا اور بے پناہ سرمایہ ڈوب گیا تھا۔

یہ تھا تناظر جس میں مجھے فیصلے کرنے تھے۔ میرا فیصلہ سب کچھ پھر سے شروع کرنے کا تھا، یہ سمجھتے ہوئے کہ جہاں تک میری پیشہ وارانہ زندگی کا تعلق تھا یہی ایک راستہ تھا۔ میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ میں صحیح معنوں میں سیدھے راستے پر چلوں گا۔ یہ کچھ آسان نہیں تھا اس لیے کہ یہ راستہ میرے خاندان کی خواہشات کے مخالف سمت کو جاتا تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ مجھے سرکاری ملازمت اختیار کر لینی چاہیے یا پھر کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہو جانا چاہئے۔ مگر میری زندگی کے ابتدائی پیشہ ورانہ دنوں کی اتھل پتھل نے مجھے سچ مچ کچھ کر گزرنے پر تیار کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ جنگ خود لڑنی ہوگی، بلند حوصلگی سے اپنی زندگی کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک حادثہ تھا جس نے مجھے موجودہ مشکل حالات میں پھینک دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اب مجھے خود فیصلہ کرنا تھا کہ میں کس راستے پر گامزن ہوں۔"

مجھے ان کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ وہ بہت جوش میں دکھائی دے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں کی جنبش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا ذہن انھیں کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ان کی گرمجوشی پُر خلوص تھی، زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کر رہا ہے اس سے پورا لطف بھی لے رہا ہے۔ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ آدمی بے چین شخصیت کا مالک ہے جو ہمہ وقت مصروف رہنا چاہتا ہے۔ مگر اُس کو قریب سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جو بھی کام کرتا ہے اس سے لطف بھی اُٹھاتا ہے، اس کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے، اور وہ فطری طور پر لطف لینے والا ہے۔ ایک آدمی جو نہ صرف ہر قسم کے مالیاتی معاملات میں اپنی طراری اور لیاقت کے باعث احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔، وہ ملنسار بھی ہے، پرانے دوستوں کا دیر تک ساتھ نبھاتا ہے اور نئے دوست بنانے میں بھی ماہر ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں ان کو گالف کھیلنے کی طرف راغب کروں اس لیے کہ، میرا تجربہ کہتا ہے کہ ان جیسے لوگ اپنے swing، جسم کی لچک اور طاقتور بازوؤں کی وجہ سے گالف کے بہت اچھے کھلاڑی بن سکتے ہیں جو اس بات میں وقت ضائع نہیں کرتے کہ کب hook یا slice کیا جائے۔ میں نے یہ نکتہ اس لیے نہیں اُٹھایا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ میرا مشورہ قابلِ قبول نہیں ہوگا اس لیے کہ ابھی کچھ عرصے تک ان کے پاس اس کھیل کے لیے وقت نہیں ہوگا۔

میں روشن علی بھیم جی سے دوستی کے باعث شروع دنوں ہی سے جہانگیر صدیقی کا پروانہ ہوگیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس نوجوان کے طریقۂ کار کے معترف تھے جس کے ذریعے یہ نرم خو مگر قوی انسان ای ایف یو کا ڈائریکٹر بننے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ایک آدمی جو اپنی عمر کے صرف چوتھے عشرے میں تھا جب اس کو ای ایف یو کے بورڈ میں ڈائریکٹر بننے کی پیش کش گئی تھی۔ آج کے مقابلے میں اس وقت تک ان کو اسٹاک ایکس چینج کے حلقے سے باہر بہت کم لوگ جانتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے جانے سے قبل میں نے کمپنی کے کاغذات سے اخذ کر لیا تھا کہ ان کو کمپنی کا ڈائریکٹر بنے بیس سال ہو چکے ہیں۔ میں نے ان سے ملتے ہی سب سے پہلے اس بات پر مبارکباد دی۔ کمپنی کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کے بورڈ پر ملک کے بڑے بڑے زیرک اور توانا ذہن والے لوگ ماضی میں ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔

جہانگیر صدیقی کی اپنی زبانی اس کمپنی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کی بے مثال کامیابی کا حال پڑھیے۔

جس وقت ہم نے مشرقی پاکستان کھویا تھا، میرا اسٹاک بروکر دوست، کراچی کے اسٹاک ایکس چینج کا ایک قابلِ احترام بروکر تھا، اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد میرے ساتھ کافی دنوں تک کام کرتا رہا تھا۔ اس نے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والی کمپنیوں، ICP اور NIT سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ وہ نیشنل شپنگ کارپوریشن کے لیے بھی بروکر کے طور پر کام کر چکا تھا اور اس ہی کی مدد سے مجھے ان کا اکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔ وہ لوگ Bonus Vouchers کی خرید و فروخت کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں آپ سب جانتے ہوں گے کہ اُن دنوں یہ زرِ مبادلہ کے لین دین میں کام آتے تھے۔ جرمنی کے Bundesbank کے ایک سابق صدر Mr Vocke اس کے موجد تھے۔ یہ ایوب خان کی حکومت کا زمانہ تھا، جب شعیب صاحب وزیرِ خزانہ تھے۔ میں National Shipping Corporation کے پینل پر تھا جو پاکستان کی سرکاری جہازرانی کی ذمے داری تھی۔ جب ذالفقار علی بھٹو نے زمامِ حکومت سنبھالی اور NSC کی انتظامیہ میں تبدیلیاں کیں تو مجھے بتایا گیا کہ کمپنی کے پینل سے میرا نام خارج کر دیا گیا ہے اس لیے کہ پینل پر کے سارے بروکروں پر یہ الزام تھا کہ ہم نے کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے، جنھیں جیل بھیج دیا گیا تھا، ساز باز کر کے بدعنوانی میں ان کی امداد کی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ برطرف کی جانے والی انتظامیہ کے ساتھ میں نے کام کیا تھا مگر میں نے، جو اس وقت صرف چوبیس برس کا نوجوان تھا، ہرگز کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تو ان لوگوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟

نوجوان اور بھولا بھالا انسان، جیسا کہ میں اس وقت تھا، غصے میں تھا اور میں نے کمپنی کے نئے چیئر مین سے ملاقات کی کوشش کی مگر مجھ سے کہہ دیا گیا کہ ان کے پاس وقت نہیں۔ میں نے فائنانس ڈائریکٹر سے ملنا چاہا، دن بھر انتظار کیا مگر وہ اس دن تشریف ہی نہیں لائے۔ ان کے پی اے نے چیف اکاؤنٹنٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ میں نے دوسرے روز آدھے دن تک ان کا بھی انتظار کیا مگر ان سے بھی ملاقات نہیں ہوسکی۔ اور مجھے ان کے بھی نائب سے ملنے کا مشورہ دیا گیا جس پر میں نے عمل کیا۔ انھیں صاحب کی مدد سے میں کمپنی کے پینل پر ڈالا گیا تھا، مگر وہ مجھے صرف اتنا ہی بتا سکتے کہ حکام کے مشورے پر انتظامیہ نے تمام پرانے بروکروں کو معطل کر دیا ہے اس لیے کہ ان سب کو 'بلیک لسٹ' کر دیا گیا ہے۔ میں پُرعزم تھا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، اپنے کمیشن میں سے کسی کو ایک پیسا بھی نہیں دیا ہے اور اس بات کا میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ بس میں یہ چاہتا تھا کسی صاحبِ اختیار سے میری ملاقات ہو جائے تا کہ میں اس بات کو ثابت کر سکوں۔

مگر ایسا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا جس کے ذریعے میں کسی ایسے شخص سے ملاقات کر سکوں جو اس فیصلے کو تبدیل کر سکے۔ تو پھر میں کیا کر سکتا تھا؟ اگر کوئی مجھ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تو صرف یہی ایک راستہ ہے کہ میں اس کمپنی کا ڈائریکٹر بن جاؤں تب ان کو بتا سکوں کہ کیا صحیح اور کیا غلط تھا۔ اور میں سچ مچ یہی چاہتا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں مجھے پتا چلا کہ NSC کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے لیے انتخاب ہونے والا ہے۔ اس پر دو نشستیں نجی شعبے کے لیے مختص تھیں اور انھی دونوں کے لیے انتخاب ہونے والا تھا۔ تو پھر ہم نے یہ کیا کہ بمشکل تمام NSC کے حصص یافتگان کی مکمل فہرست حاصل کی۔ پھر میں اور میرے ایک دوست نے اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جہاں تک ممکن ہوسکا حصص یافتگان سے ملاقات کی اور ان سب کو بتایا کہ آپ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور آپ کو اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے میں ایک ایمان دار آدمی ہوں اور اگر آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں آپ کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ اگر میں آپ کو پسند نہیں تو کسی اور کو ووٹ دے کر کامیاب کرائیے، اپنا ووٹ ضائع نہ ہونے دیجیے، حکومت کو یہ فیصلہ کرنے کا حق نہ دیں کہ وہ نجی سیٹ پر کسی کو مقرر کرے۔ ساتھ ہی میں نے اپنے دوست کے لیے بھی ووٹ مانگے۔ اور سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم دونوں کامیاب ہوئے۔ ہم کو ۶۳۰۰۰ ووٹ ملے تھے جو ہمیں ڈائریکٹر بنانے کے لیے کافی تھے۔ اس دن سے آج تک میں کارپوریشن کا ڈائریکٹر ہوں۔ بے شک میں ان سے کوئی کاروبار نہیں کرتا اس لیے کہ اس حیثیت میں میرے لیے یہ مناسب نہیں مگر کم از کم عوام کو میں نے ثابت کر دکھایا کہ اگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد ہو تو آپ افسر

شاہی اور سیاسی جوڑ توڑ کو شکست دے سکتے ہیں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہیں سے میری کارپوریٹ یا کاروباری سیاست کی ابتدا ہوئی۔ یہ میری پہلی کسی غیر کمپنی کی ڈائریکٹرشپ تھی جس کی بنا پر میں اسٹاک ایکس چینج میں بھی مشہور ہوگیا۔ وہاں کے کچھ پرانے ارکان نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کراچی اسٹاک ایکس چینج کی ڈائریکٹری کا انتخاب بھی لڑوں۔ میں اس بارے میں تذبذب کا شکار تھا اس لیے کہ میں نسبتاً کم عمر تھا اور شاید اس وجہ سے ارکان مجھے ووٹ نہ دیں۔ مگر ان سب لوگوں نے یہ کہہ کر میرے شبہات کو دور کر دیا کہ چوں کہ یہ ان کی تجویز ہے اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کریں گے کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ اور یہی ہوا۔ میں نے تین بزرگ ارکان کو شکست دے کر ایک طوفان برپا کر دیا۔''

اب بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میرے تن بدن میں ایک جوش سا پیدا ہو رہا ہے۔ میں نے کتنی بار اپنے پاکستانی دوستوں سے یہ بات کہی ہے کہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر لوگ ذرا زیادہ سیاسی ہمت کا مظاہرہ کریں اور ان کے دلوں میں واقعی جمہوریت کے لیے لگن ہو تو اس قسم کے اعمال دُہرائے جا سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کے اذہان صرف خرید کر ہی نہیں جیت سکتے، جیسا کہ ان ملکوں میں ہوتا ہے۔ آپ انھیں اس بات پر قائل کر کے کہ آپ ایمان دار ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں، ان کے دل بھی جیت سکتے ہیں۔ قائدِاعظم کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ قائد جیسے کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے ملک کی اور معاشرے کی خدمت کے نشانِ راہ چھوڑے ہیں۔''

میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ میں جہانگیر صدیقی کو قریب سے جانتا ہوں۔ اسی طرح جیسے لوگ دعوتوں پر ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں جن میں کبھی ان کی بیویاں بھی شریک ہوتی ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، جو ایک کامیاب بروکر کی حیثیت میں، اس وقت ایک کامیاب مالیاتی جادوگر کی مثال ہو چکے تھے جب انھوں نے بڑے مشکل حالات میں ای ایف یو کے حصص کی انڈر رائٹنگ کی تھی۔ ای ایف یو میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے میری شمولیت کے کچھ عرصے بعد ایک بار اچانک وہ ہم لوگوں سے ملنے میونخ آئے؛ اپنی مسحور کن اور مہم جو بیگم کے ساتھ میرے گھر بھی تشریف لائے۔ اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان گفتگو نجی سطح تک اُتر آئی تھی مگر ہم اتنے قریب کبھی نہیں ہوئے تھے جتنے کہ اس مخصوص ملاقات کے دوران ہو گئے تھے جس کے دوران جہاں تک ممکن ہوا نجی زندگی اور ان کی سوچ کے انداز کے تجزیے کی کوشش میں گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔ ہمارے تعلیمی اور تہذیبی پس منظر ہمیں ذاتی سوالات کی اجازت نہیں دیتے مگر جب میں نے اپنی ملاقات کی روداد پڑھی تو اچانک احساس ہوا کہ ایسی ملاقاتوں کے ذریعے جب ہمارے درمیان جھجک کے پردے اور احترام کا غازہ حائل نہیں ہوتا، ہم ایک دوسرے کے بارے میں کتنا جان جاتے ہیں۔

بغیر کسی سیاسی پس منظر یا وابستگی کے باوجود جہانگیر صدیقی خود کو' کارپوریٹ اور کاروباری سیاست داں' کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسے پیشہ ور کاروباری ہیں جو دور رس فیصلے کرنے سے قبل اس کے ممکنہ سیاسی امکانات اور اثرات کے بارے میں اچھی طرح سوچتے ہیں۔

مجھے یہ طریقۂ کار پسند ہے اور مجھے اس بات پر خوشی ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں میں، جو ان کے مشوروں اور نظریات کی قدر کرتے ہیں، روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں جب نواز شریف کی حکومت برطرف ہوگئی اور افواجِ پاکستان نے ایک بار پھر ملک کا نظم و نسق سنبھالا تھا، جہانگیر صدیقی کو ایک اہم اور سینئر رُکن کی حیثیت سے اکانومک ایڈوائزری کونسل کا رکن مقرر کر دیا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک کا کرتا دھرتا کوئی بھی ہو، کوئی بھی پارٹی اقتدار میں ہو، جہانگیر صدیقی جیسے افراد کی آوازوں پر سنجیدگی سے کان دھرے جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر میرے نزدیک ای ایف یو کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ اسے ان جیسے لوگوں کی رفاقت حاصل ہے، خود صدیقی صاحب کے الفاظ میں، جس کا مفاد ان کے دل سے سب سے زیادہ قریب ہے:

''جب ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا، مسٹر بھیم جی ملک چھوڑ کر انگلستان چلے گئے۔ وہ

کستان میں مستقل قیام نہیں کرتے تھے مگر ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ اسی دوران ای ایف یو کے کارپوریٹ ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں کہ کمپنی کے حصص کا ایک بڑا حصہ بازار میں فروخت کے لیے پیش ہوا۔ جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے قابلِ فروخت حصص کی تعداد کمپنی کے ُکل حصص کے آٹھ فی صد کے برابر تھی۔ ایک بروکر مجھ سے ملنے آیا اور اس نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ میں ان حصص کو خریدنے میں دل چسپی لوں گا یا نہیں؟ میں نے اپنے ایک گاہک، خیراتی ٹرسٹ کے متولی کو ٹیلی فون کیا اور ان سے ان حصص کے حصول کی بابت بات چیت کی۔ ان کی اطلاع کے لیے میں نے ای ایف یو کے بارے میں ایک مختصر سا تجزیہ تحریر کیا اور اس کے فوراً بعد یہ طے کر لیا گیا کہ ہم یہ حصص خرید لیں گے۔ دوسرے دن اس بروکر کا پھر ٹیلی فون آیا اور اس نے بتایا کہ دو تین فی صد حصص پھر فروخت کے لیے بازار میں آئے ہیں اور پوچھا کہ میرے گاہک کیا ان کو بھی، کچھ کم قیمت پر، خریدنا چاہیں گے؟ ہم نے خریدنے پر ہامی بھر لی اور اس وقت تک یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ حصص ARAG خاندان، یعنی' حبیب' کے تھے۔ ایک دو دن کے بعد اس بروکر کا پھر فون آیا اور اس نے پھر کچھ حصص فروخت کے لیے پیش کیے مگر اس بار اس نے کہہ دیا کہ اس کے بعد اس پارٹی کے اور کوئی حصص فروخت نہیں ہوں گے۔ اس پر جب میں نے اپنے گاہک سے رابطہ کیا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہا، ''بابا، کیا پاکستان میں صرف ایک ہم ہی بیوقوف رہ گئے جو ان حصص کو خرید رہے ہیں؟'' مگر بالآخر یہ حصص بھی ہمارے گاہک نے خرید لیے اور اس طرح وہ خیراتی ادارہ ای ایف یو کا خاصا بڑا حصے دار بن گیا۔ میں اس ادارے کا اس وقت سے آج تک بروکر ہوں۔ اس کے بعد جب ای ایف یو کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے انتخاب کا وقت آیا تو میں ان دنوں کے چیف اکاؤنٹنٹ واصف علی سے ملنے گیا۔ وہ بورڈ کے سیکریٹری بھی تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں بورڈ پر آنے کا خواہش مند ہوں اور ان کا کیا خیال ہے کہ اگر میں انتخاب کے لیے خود کو پیش کروں تو میرے لیے کیا امکانات ہوں گے؟ اس بات پر وہ بہت جز بز دکھائی دیے اور انھوں نے کہا کہ ای ایف یو بہت مضبوط ہاتھوں میں ہے اور یہ بھی کہ میرے انتخاب کے امکانات صفر کے برابر ہیں۔ بہ ظاہر اس وقت تک ان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ خیراتی ادارے کے حصص میرے قبضے میں تھے۔ پھر میں نے وہی کچھ کیا جو ہم نے NSC اور کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے بارے میں کامیابی سے کیا تھا، یعنی ہم نے، جہاں تک ممکن ہو سکا حصے داروں سے 'نیابتی حقوق' (proxy) حاصل کر لیے۔ اس سلسلے میں میری ملاقات مسٹر رشید سے بھی ان کے گھر پر ہوئی۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ مسٹر رشید مسٹر روشن علی بھیم جی کے معاونِ خاص تھے۔ رشید صاحب نے بھی مجھ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہتے رہے کہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ پھر رشید صاحب نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا جب کہ میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے رشید صاحب کے بارے میں حقیقت اس وقت معلوم ہوئی جب میں ای ایف یو کا ڈائریکٹر بن گیا تھا اس لیے کہ ایک دن اچانک میں نے ان کو بھیم جی صاحب کے دفتر میں بیٹھے دیکھ لیا۔

میں نے خاصے نیابتی حقوق اکٹھے کر لیے تھے اور میرے ایک مشترکہ دوست مجھے بھیم جی صاحب کے گھر ملاقات کے لیے لے گئے۔ انھوں نے مجھے بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اور بولے، ''آپ ڈائریکٹر کا انتخاب کیوں لڑنا چاہتے ہیں، ہم خود آپ کو بورڈ میں شرکت کی دعوت دیں گے۔'' اور پھر وہی ہوا۔ انھوں نے مجھے دعوت دی اور اس وقت سے آج تک میں ای ایف یو کے بورڈ میں ڈائریکٹر ہوں۔ در اصل میں ان کے دو اداروں بورڈ میں ڈائریکٹر ہوں، اس طرح کہ جب سے EFU Life کا قیام عمل میں آیا ہے میں اس کمپنی کا بھی ڈائریکٹر ہوں۔ میں جہاں تک ضروری ہوتا ہے، مشورے بھی دیتا ہوں اور امداد بھی اور میں مستقبل میں بھی یہ خدمت فراہم کرتا رہوں گا۔ میں نے اس کمپنی کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ یہ خالص پیشہ ورانہ انداز میں چلائی جاتی ہے اور اس سے منسلک رہنا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی طور میں روشن علی بھیم جی کا بھی ثنا خواں ہو گیا ہوں۔ میں ایسے عظیم لوگوں کے ساتھ کام کرنا بھی اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا ہوں، جیسے اصفہانی خاندان ہے، مسٹر ایس ایم یوسف جو اُن بہترین شخصیتوں میں سے ہیں جن سے میں آشنا ہوں۔ جس بات نے پہلے دن ہی سے

مجھے سب سے زیادہ متجسس کیا ہے وہ اس کمپنی کا پیشہ ورانہ انداز ہے جو ہر طرف نظر آتا ہے۔ ایک تاثر جو، میرے خیال میں، صرف میں ہی نہیں بلکہ عوام بھی رکھتے ہیں، ایک خالص پیشہ ورانہ انداز میں چلائے جانے والے آزاد ادارے کا تاثر۔ اگرچہ میں، میرے خاندان کے افرا اور وہ خیراتی ادارہ، جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے، اس ادارے میں خاصے بڑے اور اہم حصے دار ہیں مگر اس کی پیشہ ورانہ تنظیم کی وجہ سے ہم نے کبھی مداخلت نہیں کی ہے۔ اس ادارے نے ہمیشہ اپنی ایک مخصوص تہذیب کا تاثر دیا ہے۔ اور وہ تہذیب یہ ہے کہ یہ کبھی مالکوں کے ہاتھوں کھیلنے والا ادارہ نہیں رہا ہے۔ کبھی کوئی ایک فرد یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ کمپنی کو کس راہ پر چلنا چاہیے، ایسے فیصلے صرف پیشہ ور ملازمین ہی کرتے ہیں۔ اور کمپنی نے اس کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ مسٹر بھیم جی موجود ہوں یا نہیں، چھ ماہ یا ایک برس کے لیے بھی ملک سے باہر رہیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ ادارہ پیشہ ور ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ہمہ وقت موجودگی کی صورت میں کمپنی موجودہ نتائج سے بہتر نتائج حاصل کر سکتی تھی، مگر میں اس نکتے پر زور نہیں دینا چاہتا۔ دراصل اندازِ کار سے پید ہونے والی تہذیب ہے جو فیصلہ کن ہوتی ہے۔ میں اس قسم کا طریقۂ کار پسند کرتا ہوں اور مجھے اس ادارے کے اندازِ نے اتنا متاثر کیا ہے ک میں خود اپنی کمپنی میں بھی اسی کو اپنا مثالی طریقہ بنانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، میری کمپنی میں، میں اور میری بیوی اکثری حصے دار ہیں۔ مگر خاندان سے صرف ہم دو ہی حصے دار ہیں اور بورڈ میں صرف میں ہی شامل ہوں۔ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بتادیا ہے ک وہ جو کاروبار بھی کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ اگر وہ میری کمپنی میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اصولِ کارکردگی کے مطابق میں انھیں متعارف نہیں کراسکتا۔ وہ بورڈ کے پچھتر فی صد ووٹ ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ اس کمپنی میں ملازمت کی درخواست بھی دے سکتے ہیں مگر کسی بھی صورت میں ان کو فاضل مراعات نہیں دی جاسکتیں۔ تو میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: میں نے ۱۹۷۸ء میں ای ایف یو کی تہذیب کارکردگی سے سبق لیے ہیں کہ کمپنی کس طرح چلائی جانی چاہیے اور یہی میرا معیار ہے۔''

مجھے پورا یقین ہے کہ جہانگیر صدیقی نے ای ایف یو کے حوالے سے اپنے کردار کے بارے میں کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ جب پچھتر برس کی عمر میں روشن علی بھیم جی نے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل، یعنی ای ایف یو کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا تو صدیقی صاحب نے بہت گرمجوشی سے اُن کی مدد کی تھی۔

ای ایف یو لائف ایک پبلک کمپنی کی صورت میں ۱۹۹۲ء میں قائم کی گئی تھی اور بعد میں اس کے حصص کراچی کے بازارِ حصص میں فروخت کیے گئے تھے۔ ان حصص کی خریداری ایک دھماکا خیز کامیابی تھی۔ نیا جنم لینے والی زندگی کے بیمے کی کمپنی کے حصص ستائیس گُنا زیادہ subscribe ہوئے تھے۔ وہ کتنی خوشی کا لمحہ تھا جب کمپنی کے چیئر مین جناب بھیم جی نے کمپیوٹر کا بٹن دبا کر حصص کی تفویض کا آغاز کیا تھا۔ ۲۳/اگست ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والے پروسپیکٹس کے مطابق پانچ کروڑ روپے کے حصص فروخت ہونے تھے اور آخری تاریخ ۳/ستمبر تھی۔ یہ بھیم جی اور ان کے رفقائے کار کے لیے ایک تاریخی لمحہ تھا جب یہ معلوم ہوا کہ پانچ کروڑ روپے کے مقابلے میں بارہ ارب تینتالیس کروڑ چالیس لاکھ روپے کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ تاریخی لمحہ اس لیے اور بھی تھا کہ خود ان کے چاہنے والوں نے اس وقت حصص کی فروخت کو ناموزوں قرار دیا تھا۔ اخبار ''ڈان'' نے اپنے کارپوریٹ شعبے میں چند برس بعد لکھا تھا، ''بلاشبہ یہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا۔ جرأت مندانہ اس لیے کہ بازارِ حصص ڈیڑھ برس سے دباؤ کی کیفیت میں تھا۔ زیادہ تر بزدل ادارے اس فروخت کو کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتے۔ مگر بیمے کے گُرو، مسٹر روشن علی بھیم جی نے شاید اپنی ذاتی اور اپنی blue-chip جنرل انشورنس کمپنی کی ساکھ کے بل پر ایک جوا کھیلا تھا۔ اور سرمایہ کاروں نے اس کا جواب بارہ ارب تینتالیس کروڑ روپے کی پیشکش سے دیا۔''

یہ فخر کا موقع جناب جہانگیر صدیقی کے لیے بھی تھا۔ یہ بے پناہ کامیابی انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی اور اس کا انتساب انھیں کے نام ہونا چاہیے۔ ایسٹرن فیڈرل سے ان کے روابط اور روشن علی بھیم جی صاحب سے ان کی دوستی ایسے رشتوں میں تبدیل ہو چکی تھی جو ایک خاص قسم کی

تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ صدیقی صاحب ہمیشہ چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت میں بھیم جی کے نظریات سے اتفاق کرتے، سماجی اور سیاسی نظریات سے تو بالکل نہیں۔ کمپنی کے حصے دار کی حیثیت میں ان کا یہ خیال رہا ہے کہ تمام کمپنیوں کی انتظامیہ بیمہ داروں کے مفاد کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی ہیں اور ان کی خواہش تھی کہ حصے داروں کے مفاد کو بھی اہمیت دی جانی چاہیے۔ مگر چوں کہ بھیم جی بھی کمپنی کے بڑے حصے دار تھے اس لیے ذاتی طور پر ان کے مفادات پر بھی زد پڑتی تھی۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صدیقی صاحب کے نزدیک کمپنی کی انتظامیہ کو بیمہ داروں کے مفادات کا پورا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ مگر وہ یہ سمجھتے تھے کی حصے داروں کے مفاد کی حفاظت ان کی ذمے داریوں میں سے ایک تھی۔ مگر تمام پہلوؤں کے پیش نظر انھوں نے بلا شبہ ای ایف یو اور روشن علی بھیم جی کے حامی جنگجو کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور بھیم جی کے مفاد اور ان کی انتظامیہ کو پوری قوت سے حمایت فراہم کرنا اسی وقت سے ان کا شیوہ بن گیا تھا جب ۱۹۷۸ء میں وہ کمپنی کے ڈائریکٹر بنے تھے۔

جہانگیر صدیقی حقیقتاً تسلسل، وفاداری اور استقامت کا جیتا جاگتا مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تیرہ برس سے کراچی اسٹاک ایکس چینج کے ڈائریکٹر، نائب صدر اور صدر رہے ہیں، بیس برس سے ای ایف یو کے ڈائریکٹر ہیں، چوبیس برس سے NSC کے بورڈ پر ہیں اور بائیس برس سے KESC کے ڈائریکٹر ہیں، اور میرے خیال میں یہ ایک یاد رکھنے والی خصوصیت ہے۔ ایسی سرگرمیوں کے ذریعے صدیقی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے ملک پاکستان کی معیشت کو کیسے چلایا جانا چاہیے۔ وہ متنوع تجربات کا ایک قابلِ قدر خزانہ ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ بعید، یورپ اور امریکا کے بار بار سفر کے تجربات نے ان کو گھریلو کھانوں میں طرح طرح کے نئے اور چٹ پٹے مصالحے اور خوش بوئیں شامل کرنے کی خصوصیت عطا کر دی ہے۔ انکسار اور مستحکم مگر قدامت پسند رویوں کے اتصال اور غیر ملکی تجربات کی ملاوٹ کی ہمہ وقت خواہش نے صدیقی صاحب کو ایک قابلِ اعتماد کاروباری شراکت دار کا روپ عطا کر دیا ہے۔

ان کی اپنی کمپنی اس کی زندہ مثال ہے۔ پہلے وہ تمسکات کی دلالی اور پاکستان کے مالیاتی بازار کی خدمات کا ادارہ تھی جس کا وال اسٹریٹ کے مشہور حسب نسب رکھنے والے ادارے Bear Sterns سے اشتراک رہا تھا۔ کاروبار کے شروع ہی سے بازار میں ان کی قابلِ رشک ساکھ، اختراعی صلاحیت، جارحانہ اندازِ کار اور منفعت ان کے ادارے کی پہچان رہی ہے۔

ان کے اور ان کی خوب صورت بیوی کے ساتھ دعوت کھایئے، شیرٹن ہوٹل کے پاکستانی یا جاپانی ریستوران میں، اواری ٹاورز کے چائنیز، Gelato Affair میں آئس کریم اور Dejavu میں کافی کا لطف لیجیے، دونوں سے خدا اور دنیا کے بارے میں، امریکا اور ہانگ کانگ میں زیرِ تعلیم ان کے بیٹوں کے بارے میں یا پاکستان کی سیاست اور معاشیات کے بارے میں بحث کیجیے، یہ سب کچھ ایک شام کے کھانے کے دوران اور پُرسکون اور فطری طور پر لطف انگیز ماحول میں ہوسکتا ہے، پھر دیکھیے کہ جہانگیر صدیقی، پاکستان کا، اس وقت کا، سب سے بڑا مالیاتی جادوگر کیسا کُھلتا ہے!

# محمد علی سعید

## قانونی مشیر اور خاندان کا ایک فرد

ایسٹرن فیڈرل یونین کی کوئی بھی دستاویز اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس قانون داں کی نظر سے نہ گزر جائے۔ چند اور افراد کے ہمراہ، یہ ان باقیات الصالحات میں سے ہیں جو اگر چہ دور دور رہتے ہیں مگر آپ ان کے پختہ کار اور شفاف چہرے پر نظر کیجیے تو آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ ہر معنوں میں آج بھی یہ اس ادارے کے معاملات میں شامل نظر آتے ہیں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ میں محمد علی سعید سے اس وقت سے واقف ہوں جب یہ ای ایف یو کے قانونی مشیر مقرر کیے گئے تھے۔ یہ مدراس کے اس سپوت، عباس خلیلی کے جگری دوست تھے جو اصفہانی خاندان کے مشورے پر کمپنی کے چیئر مین بنے تھے اور جو جناب روشن علی بھیم جی کو کمپنی کے نئے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں لائے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ کی تھی کہ جب ان دو بڑے آدمیوں نے اس قدیم، خستہ حال اور روایتی ادارے کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو انھوں نے موجودہ انتظامیہ کو نہیں چھیڑا تھا۔ ان میں سے کسی کے شناسا یا دوست پچھلے دروازے سے داخل نہیں کیے گئے تھے۔ اس طرح انھوں نے موجودہ انتظامیہ کی حوصلہ افزائی سے اسی کو چست کیا اور کمپنی کو بھنور سے نکال لینے کو حقیقت بنادیا۔ کمپنی کے چیف ایگزیکٹو اور چیئر مین کے علاوہ بس ایک ہی شخصیت محمد علی سعید کی تھی جن کو ادارے کا قانونی مشیر بنایا گیا تھا۔ ادارے کے نئے رہنما ان کو محکم، قابل، جارحانہ انداز رکھنے والے قانونی اختراعی ذہن کے طور پر جانتے تھے جنھوں نے پاکستانی سیاست کے مشہور زمانہ 'راولپنڈی سازش کیس' میں بے مثال زیرکی اور ثابت قدمی سے اپنی پہلی اور فیصلہ کن کامیابی کا تاج اپنے سر پہ رکھا تھا۔

محمد علی سعید ۱۹۲۵ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم اور بی اے آنرز اسی شہر میں کیا اور قانون پڑھنے کے لیے دلّی چلے گئے۔ کالج میں ایک سال تک پڑھنے کے بعد وہ، ہندوستان کے سابقہ چیف جسٹس اور وائس چانسلر کے Bachelor of Civil Law (BCL) کے کورس میں داخل ہو گئے، جس کی تعلیم دلّی میں ہوتی تھی مگر امتحان کے پرچے لندن سے بن کر آتے تھے۔ LLB کے پہلے چار درجے کے طلبہ کا تبادلہ BCL میں کر دیا گیا تھا جن میں ایک محمد علی سعید بھی تھے۔ BCL کی تعلیم کے دوران دلّی میں فسادات ہو گئے اور محمد علی سعید کو مدراس واپس جانا پڑا جو اس نوع کی گروہی بے چینیوں سے قطعی طور پر پاک تھا، اور وہیں انھوں نے Bachelor of Law مکمل کیا۔ انھوں نے ابتدائی کارآموزی کا زمانہ اپنے شہر ہی میں مکمل کیا اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر گئے جہاں انھوں نے اپنی تیئسویں سالگرہ منائی۔ اپنی عمر کے لوگوں کی طرح وہ بھی پاکستان اکیلے ہی آئے تھے۔ ان کے والد ۱۹۶۲ء میں سرکاری ملازمت سے فراغت تک وہیں رہے۔ بعد میں وہ بھی پاکستان آگئے اور اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہے، جن میں سے ایک محمد علی سعید تھے۔

محمد علی سعید کے والد مدراس پریزیڈینسی میں (اس زمانے میں مدراس ایک پریزیڈینسی تھا) انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ وہ پورے برطانوی ہندوستان میں پہلے مسلمان تھے جو کمشنر آف انکم ٹیکس بنے تھے اور تمام پریزیڈینسی میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد انھوں نے بھی

اس وقت اپنا شہر چھوڑ دیا تھا جب غلام محمد، جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے تھے، حیدرآباد دکن کے وزیرِخزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے تھے اور انھوں نے حکومتِ ہندوستان سے ایک ماہرِمعاشیات اور انکم ٹیکس کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔ حکومت نے محمد علی سعید کے والد کی خدمات غلام محمد اور ان کی وزارتِ خزانہ کو پیش کر دیں۔ انھوں نے وہاں آبکاری (Excise Taxation) محصولِ آمدنی (Income Tax) کے محکموں کی ابتدا کی۔

محمد علی سعید جب کراچی منتقل ہوئے تو کنوارے تھے۔ ان کی جناب اے کے بروہی سے شناسائی ہوگئی، جو شاید اس زمانے ہی سے ،صرف سندھ یا کراچی میں ہی نہیں، پورے پاکستان میں چوٹی کے قانون دان سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس نوجوان دوست کو اپنے قانونی معاونوں میں شامل کرنے کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں بروہی صاحب راولپنڈی سازش کیس کے چیف پرازی کیوٹر مقرر کیے گئے، جس میں بہت سے معروف لوگ مجرم قرار دیے گئے، جناب سید سبطِ حسن ان میں سے ایک تھے، جو کئی برس بعد ای ایف یو میں تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

محمد علی سعید نے ڈیڑھ برس حیدرآباد میں قیام کیا اور جنوری ۱۹۵۲ء میں، جب وہ مشہور مقدمہ چل ہی رہا تھا، ایک محترم خاندان کی ایک خوب صورت دوشیزہ سے شادی کر لی۔

۱۹۵۳ء میں ان کے اتالیق، جناب بروہی، وفاقی حکومت میں وزیرِقانون بنا دیے گئے اور محمد علی سعید ان کے دفتر سے اپنی وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۶۰ء تک ان کے اپنے الفاظ میں وہ، ''ایک خاصا معروف اور کامیاب نوجوان قانون داں بن چکا تھا۔ اس وقت تک میں بہت سے ایسے، اچھے اور دل چسپ مقدمات کی پیروی کر چکا تھا، مجھ سے سینئر وکلا بھی جن میں ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس وقت تک وکالت کے پیشے میں اپنے نقش ثبت کر چکا تھا اور عباس خلیلی کی مجھ پر نظر تھی۔ جسٹس شہاب الدین بھی، جو بعد میں تھوڑے عرصے کے لیے وزیرِانصاف بنے، مجھ پر نظر رکھتے تھے، میرے بارے میں اچھے خیالات کے حامل تھے اور عباس خلیلی سے میرا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بس اس طرح میرا رابطہ ای ایف یو سے ہوا اور میں اس ادارے کا قانونی مشیر بن گیا۔ اور جب میں اس دارے سے منسلک ہوا تو جن لوگوں سے میری پہلی شناسائی ہوئی ان میں آپ خود، یعنی ولفرام کرنوسکی، جناب امین خراسانی جو اس وقت چیف اکاؤنٹنٹ تھے، نوجوان انکچوری ساجد زاہد جو انھی دنوں اس ادارے میں شامل ہوئے تھے۔ اور وہ مسحور کن دن تھے۔ خلیلی اور بھیم جی بھی کچھ عرصے قبل ہی شامل ہوئے تھے اور انھوں نے مجھے ان حالات سے آگاہ کیا جن سے وہ اس کمپنی کو نکالنا چاہتے تھے، جس کا ماضی نہایت شان دار رہا تھا مگر اب یہ تیسرے درجے کا ادارہ بنتا جا رہا تھا۔ کمپنی کی مشکلات ایک نہایت نازک اور بحرانی کیفیت میں تبدیل ہوئیں اور اس کو ایک مستحکم قانونی بنیاد پر قائم رکھنے کے لیے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی پیش کش کی جو میں نے قبول کر لی۔ یہ ایک باہمی اعتماد اور بھروسے کا ساتھ تھا۔ یہی معاملہ خلیلی اور اصفہانی کے درمیان تھا۔ وہ انھیں اور ان کے خاندان کو قریب سے جانتے تھے۔ اصفہانی کو خلیلی پر پورا بھروسا تھا۔ وہ بھی نسلاً ایرانی تھے، ان پر بھروسا کرتے تھے اس لیے ان کو کمپنی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اور یہ خلیلی ہی تھے جنھوں نے ڈھاکے میں اپنے دوستوں کو باور کرایا کہ بھیم جی ان کے ساتھ ہوں گے اور اس ذمے داری کو اٹھانے پر تیار ہوں گے۔ اس طرح یہ ایک بحالی کا عمل تھا اس لیے کہ اس کے بعد ہی دوبارہ سبزہ اُگنا شروع ہو گیا۔''

تقرری کے وقت وہ کراچی کے ایک کامیاب اور معروف وکیل تھے، جن کے قانونی مشورے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جن کا حصول 'سستا' نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی روشن علی بھیم جی کے معتمد دوست بن گئے، جو اپنے خاندانی معاملات میں بھی ان سے مشورے کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا، ہر اتوار کی صبح کو وہ روشن علی بھیم جی سے ملاقات کے لیے ان کے گھر جاتے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے گھرانے کے فرد کے مانند ہو گئے تھے۔ زندگی بھی ایک دل چسپ تجربہ ہوتی ہے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ مختلف

کردار اور نظریات کے لوگ کس طرح ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں ۔ میرے خیال میں ان دو مختلف کردار کے افراد کے مابین دوستی ایک اچھی مثال فراہم کرتی ہے ۔ بھیم جی اور ان کے درمیان، ان کا انکسار، ان کا تیز طرار ذہن اور ان کی دانشورانہ آب و تاب دونوں کے ملاپ کے لیے ایک مثالی اتصال تھا۔ سعید اپنے دوست کے کرشماتی نظریات پر حیرت زدہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں نے ان کو بہت واضح سیاسی بصارت کا حامل انسان پایا۔''

میں سعید صاحب سے ملنے صدر بازار میں ان کے دفتر گیا، جو توقع کے عین مطابق ایک وسیع کمرے، چھدرے فرنیچر، بہت ساری کتابوں سے بھری الماری اور درمیان میں ایک کشادہ سی میز پر مشتمل تھا۔ میں نے ان کو بہت واضح سیاسی بصارت کا حامل انسان پایا۔ میں ان کو اسی دفتر میں چالیس برس قبل بھی دیکھا تھا جس میں آنے والے مؤکلین کے لیے ایک صوفہ اور چند کرسیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس اندھیرے سے دفتر میں براجمان قانون کے اس ماہر کے پاس کتنے پریشاں حال اور کتنے لالچی مؤکل مدد کے لیے آ کر بیٹھتے ہوں گے، جو شاید ہی کبھی ان کو مایوس لوٹاتا ہوگا۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا اور وہ میرے مقابل ایک آرام دہ کرسی میں۔ ریکارڈنگ مشین چل رہی تھی مگر نہ وہ اور نہ ہی میں اس سے پریشان تھے۔ اس لیے کہ ہم اپنے ایک مشترکہ دوست کے بارے میں باتیں کر رہے تھے مگر یک بارگی اچانک ان کا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ آواز، جس میں جوش اور گرمی آ گئی تھی، قدرے اونچی ہو گئی۔ انھوں نے کہا، ''روشن میں ایک خداداد صلاحیت تھی، لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے اور شاید یہی بات تھی جو لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی۔ اور یہ بھی ہے نا کہ انھوں نے اس رُتبے پر پہنچنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ میں انھیں ایک social climber نہیں کہوں گا۔ مگر ایک تو ان کا اپنا ایک طریقۂ کار تھا اور ان میں ایک کشش تھی جو لوگوں کو ان کے قریب لے آتی تھی۔ آپ صاف طور پر دیکھ سکتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے، اس میں ان لوگوں کی جھلک ملتی تھی جو ان کے نزدیک ایک معیار تھے، جیسے جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظم۔ جب وہ نوجوان تھے، ان شخصیتوں سے ان کے قریبی روابط رہے تھے۔ دراصل زیادہ تر سیاست دانوں سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے جو یا تو قیامِ پاکستان کی تحریک میں فعال رہے تھے یا پھر پاکستان کے ریاستی ڈھانچے کا حصہ رہے ہیں۔ اگر چہ انھوں نے سیاست میں کبھی براہِ راست حصہ نہیں لیا، انھیں اس میں دل چسپی بہت رہی ہے اس لیے اس میدان میں بھی ان کی شخصیت خاصی وزنی تھی۔ ہم نے کبھی سیاست اور معاشیاتی مسائل پر گفتگو ضروری نہیں جانا مگر ملک کے سماجی پہلوؤں پر میں ان کے خیالات سے واقف رہا ہوں۔ جو چیز ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی وہ معاشیاتی سطح کی ناانصافی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ لیاقت اور ہنر مندی کی سرپرستی کی ہے، حمایت کی ہے، اقربا پروری اور جانب داری سے نفرت کی ہے۔ جب بھی انھوں نے دیکھا ہے کہ بنیادی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے تو انھوں نے مختلف عدالتوں سے شکایت کی ہے۔ روشن نے بھی سیاسی اداروں کے تحفظ کے پیشِ نظر سیاست میں عملی حصہ لیا ہے۔ سیاست میں خود کبھی نہیں کودے مگر ہمیشہ اس کے پیچھے چلتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کی صحیح لوگ منتخب ہوں اور انھوں نے صحیح لوگوں کو صحیح مقامات پر رکھنے کے لیے مجھے استعمال کیا ہے۔''

طویل عرصے کے ان کے ساتھی کا یہ تجزیاتی مطالعہ ان کے سوچ کے انداز اور عقائد پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ خود اپنے مؤکل کے مقدمات کسی ذاتی، سیاسی اور مذہبی عقیدے سے قطع نظر کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دوست روشن علی بھیم جی ہی نہیں بلکہ دوسرے ساتھیوں کے سے بہت سے معاملات میں اتفاق نہیں کرتے مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایک اصولی انسان ہیں اور اقربا پروری یا جبر کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے، کہا تھا ''اب ذوالفقار بھٹو ہی کو لیجیے، ایک طباع ذہن کا انسان۔ وزیرِ اعظم بننے کے بعد ان سے میرے روابط اچھے نہیں رہے حالاں کہ اس سے قبل وہ میرے اچھے دوست تھے۔ میں نے ان کی حمایت بھی کی تھی اور رعایت بھی۔ مگر جوں ہی میں بار ایسوسی ایشن کا صدر بنا، وہ میرے خلاف ہو گئے۔ وہ پسند اور ناپسند کے معاملے میں بڑے شدت پسند تھے۔ اور ان کی ناپسندیدگیاں پسندیدگی کے مقابلے میں بہت زیادہ

تھیں۔ آخر میں وہ ایک خطرناک نسل کے سیاست داں ظاہر ہوئے۔ وہ ایک منتخب آمر تھے۔ ایک فرانسیسی مفکر نے کہا تھا کہ منتخب آمریت سے بُری کوئی چیز نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اختیاری ظلم و جبر عوام کے نام سے کیا جاتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں بھٹو وہی کچھ تھے۔"

تمام زندگی محمد علی سعید اس یقین پر کاربند رہے ہیں کہ انسان کو خود اپنا راستہ بنانا چاہیے اور اسی راستے پر چلتے رہے جو انھوں نے بہت عرصہ پہلے سے اپنے لیے متعین کرلیا تھا۔ اور انھوں نے ایسے چند اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی جو انھوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ ان کے ضمیر نے انھیں کبھی دھوکا نہیں دیا نہ ہی فیصلہ کرلینے کے بعد کبھی انھوں نے اپنا راستہ بدلنے کے بارے میں سوچا، جب تک کہ کوئی اور اس فیصلے کو غلط ثابت نہیں کردیتا۔ انھیں اپنا پیشہ پسند ہے اور انھیں اس پر کبھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ اور میرے خیال میں ان کا شاید ہی کوئی دوست اس سے اختلاف کرے گا۔

میں نے ہمیشہ ان کو، ان کے متوازن اور تنقیدی ذہن کے حوالے سے سراہا ہے۔ جب وہ کسی پر تنقید کررہے ہوں تو وہ اپنے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے قائل نہیں، وہ ہمیشہ مثبت طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جب انھوں نے مجھے بتایا کہ پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد ان کے والد کے قریبی دوست تھے تو میں نے غلام محمد کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کیے جو ایک عرصے تک پاکستان کے سیاسی افق پر چھائے رہے تھے۔ اور محمد علی سعید نے فوراً پاکستان کی تاریخ کی اس متنازعہ شخصیت کا، جس کے بارے میں تاریخ داں مختلف خیالات رکھتے ہیں، اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک کاٹ دار تجزیہ پیش کردیا۔

"جناح صاحب مالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، اُسی طرح جیسے سر ظفر اللہ خان پر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ اعتماد حق بجانب تھا۔ ان دونوں نے نوزائیدہ ملک کے لیے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ مگر غلام محمد اقتدار کے بھوکے انسان بھی تھے۔ وہ ایوانِ اقتدار میں خود کو مستحکم رکھنے کے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔ ان کی لغت میں کوئی لفظ بھی غلط نہیں تھا۔ وہ ایک میکاولی قسم (machiavellian) کی شخصیت تھے۔ مگر وہ ہمیشہ خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے، حالاں کہ جب وہ گورنر جنرل تھے، ان کے سارے وزرائے اعظم ان کی انگلی پر ناچتے تھے۔ وہ کبھی مطمئن نہیں رہتے تھے، بالخصوص پارلیمان کے حوالے سے۔ انھیں اپنے وزرائے اعظم پر کبھی اعتماد نہیں رہا۔ وہ خود سب کچھ ہونا چاہتے تھے، اور یہ بلا شبہ منافقت کی بدترین صورت ہوتی ہے اس لیے کہ ان جیسی دانشورانہ صلاحیت کے انسان کو اپنی حدود سے واقف ہونا چاہیے"

ایک ممتاز قانون داں ہونے کے حوالے سے محمد علی سعید کی شہرت اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۹ء میں انھیں ہائی کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ مگر دو برس بعد ہی انھوں نے جج کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اس لیے، جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ "میرے بچے امریکا میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور میں ان کے تعلیمی اخراجات اس تنخواہ سے برداشت نہیں کرسکتا تھا جو اس زمانے میں ایک جج کو ملتی تھی۔"

جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے اس وقت سے واقف ہیں جب میں ای ایف یو کے منظر میں شامل ہوا تھا۔ ان چار عشروں کے درمیان میں ان کے ذہن کی دراکی، ان کے ناقابلِ یقین تیز ذہن، اور (جیسا کہ کسی نے 'آلیور کرامویل' کے بنائے ہوئے پارلیمان کے بارے میں کہا تھا) 'انگریزی قانون کے ٹیڑھے میڑھے اور ungodly جنگل' میں سے کامیابی سے گزر جانے کی صلاحیت کا قائل رہا ہوں۔ مگر میں ان کا نہ صرف ایک صاحبِ علم اور قابل قانون داں، کاروبار کو سمجھنے کی صلاحیت، دنیا دیکھے ہوئے اور وسیع ذہن کے مالک انسان ہونے کا معترف ہوں بلکہ میں نے ان کو ایک قابلِ اعتماد اور اعلیٰ درجے کا مہذب انسان بھی پایا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "میرا ای ایف یو میں کوئی حصہ نہیں ہے، میں اس کا ڈائریکٹر بھی نہیں ہوں، بس اس ادارے کا قانونی مشیر ہوں۔ مگر میں اس حیثیت میں بھی ای ایف یو خاندان کا حصہ ہوں۔ میں جو کچھ کام کرتا ہوں اس کی فیس لیتا ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری فیس واجبی ہوتی ہے، اس سے بہت کم جو میں عام طور پر اپنے دوسرے مؤکلوں سے لیتا ہوں۔ میں ان کے لیے فیس کی خاطر کام نہیں کرتا، اور جیسا کہ

میں نے کہا ہے کہ اس کمپنی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری اپنی کمپنی ہے۔ اور یہ احساس جناب بھیم جی کی شرافتِ نفسی نے، اور ان کی معرفت سے سیف الدین زومکاوالا جیسے دوسرے لوگوں نے میرے دل میں جاگزیں کر دیا ہے جنھیں انھوں نے اپنے جانشیں کے طور پر تیار کیا تھا۔ اور ایسے جگری دوستوں کی وجہ سے جیسے آپ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ای ایف یو اب ایک مضبوط انتظامیہ کی بنیادوں پر استوار ہوگئی ہے۔ لائف کمپنی میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ روشن علی اب خود کو ایک خوش قسمت آدمی سمجھ سکتے ہیں اس لیے کہ وہ سیف الدین اور طاہر ساچک جیسے آدمی تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ ایک مضبوط انتظامیہ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں جیسی آج پاکستان کی کسی بھی بیمہ کمپنی کو میسر نہیں، باوجود اس کے کہ ان کا ایک مدِ مقابل جسامت میں ان سے بڑا نظر آتا ہے۔ مگر یہ تو صرف اعداد و شمار کی باتیں ہیں جو کل تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ای ایف یو خود اس کی بہترین مثال ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ای ایف یو محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کس حد تک ایسا رہے گا، یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی بنیادوں کو اور کتنا مستحکم کرتے ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ مستقبل میں بھی انھی نقوش پر کام کیا جائے گا۔‘‘

محمد علی کے پائے کے انسان سے کمپنی کے رشتے استوار کرنے میں، جب وہ کمپنی کو بچانے میں کوشاں تھے، عباس خلیلی اور روشن علی بھیم جی دونوں نے ہمت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دور اندیشی اس لیے کہ پچھلے چار عشروں میں بہت سے ایسے مواقع آئے ہیں جن میں محمد علی سعید جیسے نئے قانونی مشیر نے صرف اپنی موجودگی سے اور دیے گئے مشوروں سے اس عظیم ادارے کے وقار میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ہمت اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے تنقیدی دماغ سے معاملہ رکھنا ہمیشہ آسان نہیں ہوگا۔

ان کی کھردری جلد کے نیچے، جو ان لوگوں کا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جو قانون کے میدان میں بلند رُتبہ ہوتے ہیں، یقیناً ایک خاندانی نزاکت کی نرم تہ چھپی ہوئی ہے۔ کیا وہ ایک اچھے باپ تھے، میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں، اس کے لیے ان کی بیٹیوں سے پوچھنا پڑے گا، میں جن سے واقف نہیں ہوں۔ مگر یقیناً وہ ایک اچھے نانا ضرور ہوں گے، اگر بن گئے ہوں۔ جب میں اور میری بیوی ان سے اور ان کی رفیقِ حیات شمیم سے ملاقات کے لیے ان کے خوب صورت انداز میں سجائے ہوئے مکان، نفاست سے رکھے ہوئے باغ، درختوں سے آویزاں ثعلبِ مصری (Orchids) سے متعارف ہوئے تو ہم نے سیاست پر باتیں نہیں کیں، شہر کے حالات پر تبصرے نہیں کیے، پاکستان میں عدلیہ کے مستقبل اور ملک کے ایک سابق وزیرِ اعظم پر جاری مقدمے اور اس نوع کے معاملات پر گفتگو نہیں ہوئی۔ ایسا لگا گویا اتنے دنوں کے بعد ہمارے پاس بات کرنے کے لیے الفاظ نہیں رہے تھے۔ ہم نے شمیم کے اسکول کی بابت باتیں کیں اور ان کے دوستوں کے حلقے کے بارے میں جن کی کوششوں سے نچلے طبقے کی لڑکیوں کو بنیادی تعلیم فراہم کی جارہی ہے۔ محمد علی سعید ایک بہتر سماج بنانے کی کوششوں پر فخر محسوس کررہے تھے۔ اور جب ان کی اہلیہ مصوری کے شہ پاروں کے حصول کے بارے میں اپنی کارکردگی کا تذکرہ کررہی تھیں تو محمد علی سعید سراپا تبسم دکھائی دے رہے تھے۔ اس عصر کے مصوروں میں اس وقت کے سب سے معروف مصور گل جی سے ان کی اہلیہ کی ملاقات، ایک شہ پارے کی خریداری اور مکان میں آویزاں ہونے کی تفصیل کے بیان سے اگرچہ وہ دور دور سے تھے مگر دل چسپی لینے کا اظہار ضرور کررہے تھے۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اور ان دونوں کے خوشی کے لمحات کے تصور سے وہ محظوظ ضرور ہوئے ہوں گے۔ یہ سب کچھ کسی پیشہ ور قانون داں کے دفتری اوقات کے لمحات سے کتنا مختلف ہوتا ہے، شاید اسی لیے ان کو ان باتوں سے سرور آمیز طمانیت ملتی رہی ہوگی۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تھے، اس وقت محمد علی سعید کے باورچی کے بچے باغیچے میں کھیل رہے تھے۔ پھر ہم دونوں نے محمد علی سعید کو اپنے باورچی کے بچوں سے، جو خاصے صاف ستھرے لباس میں تھے، انہماک سے باتیں کرتے دیکھا۔ محمد علی سعید ہولے ہولے ان کے گالوں کو تھپتھپا اور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ ایک اچھے دوست کے گھر سے ہمیشہ یاد رکھنے والا منظر، کیا اچھا تحفہ تھا!

# جسٹس میاں محمد محبوب

## ایک محافظ، ایک مصلح

جسٹس محبوب سے میرا پہلا رابطہ روشن علی بھیم جی کی وساطت سے ہوا تھا۔ ان دنوں وہ انشورنس ریفارم کمیشن کے چیئر مین تھے، میرے دوست بھی جس کے ایک رُکن تھے۔ میں اس وقت میونخ ری کی ملازمت میں تھا اور جسٹس محبوب بین الاقوامی تجربے کے حامل کسی فرد سے، کوئی ایسا جو انھیں بیمے کی صنعت میں ہونے والے جدید رجحانات خصوصاً زرعی فصلوں کے بیمے کی بابت آگاہ کرسکے، بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ میں اس میدان کا ماہر نہیں تھا، مگر میونخ کے ساتھیوں کے ذریعے میں ان کے لیے ضروری معلومات اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ان دنوں جسٹس محبوب لاہور ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے اور روشن علی بھیم جی سے ان کی اس وقت سے واقفیت تھی جب وہ لندن سے واپس آکر بینظیر بھٹو کی کیبنٹ میں بیمے کے مشیر کے طور پر کام کررہے تھے۔ جب میری جسٹس محبوب سے مارچ ۱۹۹۰ء میں لاہور میں ملاقات ہوئی اس وقت وہ حکومت باقی نہیں رہ گئی تھی مگر یہ دونوں حضرات اچھے دوست بن چکے تھے۔ ہماری ملاقات اچھی رہی۔ انھوں نے مجھے اپنی سرکاری قیام گاہ پر خوش آمدید کہا تھا، اس وقت وہاں بہت سے سرکاری افسر بھی حاضر تھے۔ میں نے جوں ہی ان سے ہاتھ ملایا، ان کو پسند کرنے لگا تھا، یا یوں کہوں کہ جب ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اس لیے کہ وہی موقعے کے لحاظ سے مناسب بھی تھا۔ ہماری سرکاری ملاقات زیادہ دیر نہیں چلی، اس لیے ہم دونوں کے پاس سننے سنانے اور مشترکہ دل چسپیوں کی کھوج کے لیے کچھ وقت باقی رہ گیا تھا۔ مجھے ان کا کشادہ اور دوستانہ چہرہ، ان کی مہربان آنکھیں اور ان کا میرے دوست کے بارے میں محبت بھرے انداز میں باتیں کرنا اچھا لگا۔ میری ان سے پھر ملاقات روشن علی بھیم جی کے گھر ایک دعوت میں ہوئی۔ ہم نے پاکستان کی مختصر سی تاریخ، اس کے مستقبل اور اس کی معاشیاتی کارگزاریوں اور ناکامیوں پر باتیں کیں۔

وقت گزرتا رہا، کافی دنوں تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ان کے بارے میں باخبر رہتا اس لیے کہ جب بھی میں کراچی آتا ہمارے مشترکہ دوست روشن علی بھیم جی ان کے بارے میں بہت باتیں کرتے۔ کراچی میں بھیم جی سے میری طویل ملاقاتیں رہتیں اس لیے کہ اب ان کی دوڑ دھوپ کرسی کی نشست تک محدود رہ گئی تھی اور انھوں نے ملک سے باہر جانا ترک کردیا تھا۔ وہ جسٹس محبوب کا بڑا احترام کرتے تھے جو ای ایف یو کو دوبارہ زندہ کرنے میں ان کے سب سے بڑے حمایتی تھے۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں جب اس کمپنی کا افتتاح ہوا تھا تو وہ مہمانِ اعزازی تھے۔ میں نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ ای ایف یو میں جسٹس محبوب سے ملنے ضرور جاؤں گا اس لیے کہ گروپ کی تاریخ لکھنے کے منصوبے کے لیے اور ای ایف یو کے دوبارہ زندہ کرنے میں جسٹس محبوب کے کردار کے تذکرے کے بغیر یہ منصوبہ نامکمل رہے گا۔ ہم نے سوچا کہ ای ایف یو کے جاذبِ نظر نگار خانے کی ان عظیم شخصیتوں میں، جنھوں نے اس منفرد ادارے کی بنیاد گزاری اور ترقی میں

ہاتھ بٹایا ہے، جسٹس محبوب کی شمولیت بھی مناسب اور بر وقت ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ میں اسلام آباد میں بے حد متین، برد بار، قابل اور صاحبِ علم شخصیت میاں محبوب کے دفتر میں باتیں کر رہا تھا جو پاکستان کی شرعی عدالت کے چیف جج کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ واقعہ ہمارے مشترکہ دوست کے انتقال سے ایک سال قبل کا ہے۔ اور پھر اچانک مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میرے مرحوم دوست ان معنوں میں بڑے ہی خوش قسمت تھے کہ جب بھی وہ کسی اہم معاملے میں الجھے ہوئے ہوں تو مہربان تقدیر ہمیشہ ان کی امداد کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت فراہم کر دیتی تھی جس کی عملی امداد پر پورا بھروسا کیا جا سکتا ہو۔ جسٹس محبوب کی شخصیت میں انھیں ایک ایسا حمایتی مل گیا تھا جو زندگی کے بیمے کی صنعت کو نجی شعبے میں دوبارہ زندہ کرنے کی جنگ میں ان کے شانہ بہ شانہ کام کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی اہم ایک بات ہو چکی تھی۔ وہ یہ تھی کہ جسٹس محبوب کی شخصیت کے پردے میں ایک ایسا مخلص اور جگری دوست مل گیا تھا جس کی سوچ، جس کے تصورات، اور جس کا تیقّن ایک ایسا آئینہ تھا جس میں وہ اپنی جھلکیاں صاف دیکھ سکتے تھے۔

جسٹس محبوب، روشن علی کے دوست تھے مگر عمر میں بہت کم۔ وہ ۱۹۳۳ء میں عراق کے دارالحکومت بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مشرقِ وسطیٰ میں ایک برطانوی مشن سے منسلک تھے جو ان دنوں بغداد میں مقیم تھا۔ ان کا تعلق ہندوستان کی پولیس سے تھا، جرائم کی تحقیق سے متعلق (forensic) سائنس کے ماہر تھے اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ جسٹس محبوب کا بچپن لاہور، لائل پور جو اب فیصل آباد کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے بعد دلّی میں گزرا تھا جہاں ان کی بیشتر ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔ دلّی ان دنوں پولیس کے محکمے کی انتظامیہ کا مرکز تھا جہاں ان کے والد تعینات تھے۔

دلّی بورڈ سے میٹرک کرنے کے فوراً بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔ جسٹس محبوب کی اعلیٰ تعلیم فارمین کرسچین کالج میں ہوئی جو اب ایف سی کالج کے نام سے موسوم ہے۔ سائنس میں گریجویشن کرنے کے بعد لاہور کے لا کالج میں داخل ہو گئے، چند برس خرابیِ صحت کے باعث ضائع ہوئے اور بالآخر ۱۹۵۷ء میں قانون کی سند لے کر فارغ ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف حیثیتوں میں وکالت کی، کمپنی اور کارپوریٹ لا، مرکنٹائل لا اور آئینی قانون کے میدان میں۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں براہِ راست لاہور ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا تھا۔

وہ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک اہم اور محترم رُکن تھے جہاں وہ آئینی اور دیوانی، بالخصوص کاروباری مقدمات کی وکالت کرتے تھے۔ وہ پاکستان انشورنس کارپوریشن، اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان، نیشنل انشورنس کارپوریشن اور کئی بڑی انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی اداروں کے قانونی مشیر تھے۔

انھیں اور کئی باعزت ذمے داریاں سونپی گئی تھیں۔ چیئرمین پراونشل الیکشن اتھارٹی آف پنجاب کی حیثیت میں انھوں نے تین انتخابات کرائے اور بارہ برس تک یہ ذمے داری نبھائی۔ لاہور ہائیکورٹ کے بینکنگ جج رہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ انشورنس ریفارمز کمیشن آف پاکستان کے چیئرمین رہے جو پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تنظیمِ نو کے لیے قائم کیا گیا تھا جس کی تجاویز پر، لائف اور جنرل دونوں کے میدان میں دور رس تبدیلیاں کی گئیں جن میں غیر روایتی بیمے، فصل، صحت اور مویشی کے بیمے بھی شامل تھے۔ کمیشن کی جامع رپورٹ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کمیٹی اور اس کے چیئرمین کو دی گئی ذمے داریوں سے کتنا لگاؤ تھا۔ کمیشن کی تجاویز میں سے کچھ کو نافذ کر دیا گیا ہے، جو اس نوع کے اہم معاملات میں ایک بڑا غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے۔ جسٹس محبوب اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں گے اس لیے اور بھی کہ مقتدر بین الاقوامی ادارے، مثلاً عالمی بینک نے اس میں بہت دل چسپی لی اور اس کا ایک وفد کمیشن کی سفارشات پر بات چیت کرنے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ نجی شعبے سے اس کمیٹی میں تین ارکان شامل کیے گئے تھے جن میں سے ایک روشن علی بھیم جی تھے۔

''جناب بھیم جی سے، جو اس کمیشن کے ایک رُکن تھے، میں اسی حوالے سے متعارف ہوا تھا۔'' جسٹس محبوب گویا ہوئے جب میں دسمبر ۱۹۹۹ء کی خوب صورت سنہری صبح کو ان سے ملا تھا، وہ سیاہ لباس میں شریعت کورٹ کے دو قابل ساتھیوں سے مشاورت میں مشغول تھے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں ان سے، جو بھیم جی صاحب کے آخری وقت کے دوستوں میں سے تھے، پہلے مل چکا تھا اور ان سے پھر ملاقات کے لیے بے چین تھا تا کہ وہ مجھے اپنی دوستی کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔

''کمیٹی کے ارکان میں امدادِ باہمی کا جذبہ تھا اور میں بہت خوش تھا کہ ہم آخرِ کار ایک متفقہ رپورٹ بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دراصل وہ بھیم جی صاحب ہی کی شخصیت تھی جس نے کمیشن کی سفارشات میں اپنی دانش کا سارا وزن ڈال دیا تھا۔ ایک اہم بات تھی جس نے میری نظروں میں ان کا وقار بڑھا دیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ جب میں نے یہ تجویز پیش کی کہ چوں کہ بیمہ ایک عام تجارتی شے نہیں ہے اس لیے اس کے اداروں کے منافعے کی تقسیم مروّجہ طریقۂ کار سے نہیں ہونی چاہیے۔ میرا کہنا تھا کہ بیمہ ایک کاروبارِ خدمات ہے اس لیے صرف منافعے کی تقسیم ہی بیمہ کمپنی بنانے کا جواز نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ حصے داروں کو بہت زیادہ منافعے کی تقسیم سے روکنے کے لیے کوئی حد مقرر کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اور بھیم جی صاحب نے خود، جو نجی شعبے سے آئے تھے، میری تجویز کی حمایت کی۔ میری طرح وہ بھی بیمے کو ایک قسم کی سماجی خدمت، عوام کے لیے دولت جمع کرنے اور ان کی بھلائی کے لیے ایک اچھا ذریعہ سمجھتے تھے اس شرط کے ساتھ کہ سرمایہ کاروں کے مفادات کو نظر انداز نہ کر دیا جائے اور ان کے سرمائے پر بھی مناسب منافع ملتا رہنا چاہیے۔ میں ضرورت سے زیادہ تقسیم کے فلسفے پر معترض تھا اور مجھے خوشی تھی کہ بھیم جی جیسے انسان کی حمایت بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے ان کو ایک عظیم پیشہ ور پایا۔ ان کے خیالات مجھ سے بہت ملتے تھے۔ مثال کے طور پر میں نے ہمیشہ زندگی کے بیمے کو بنیادی طور پر سماج میں بچت کا ذریعہ سمجھا ہے۔ مگر بدقسمتی سے نجی شعبے کو اس معاملے میں بہت ملوث پایا جاتا ہے۔ مگر بھیم جی صاحب واحد شخص تھے جنھوں نے میرے نظریے کی حمایت کی تھی اور اگر میرا بس چلے تو میں پھر کوشش کروں گا کہ سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے زندگی کے بیمے سے ہونے والے منافعے پر ایک اوپری حد نافذ کی جائے۔''

مجھے یہ جان کر یک گونہ سکون کا احساس ہوا کہ اس قانون داں کو ملک میں بیمے کی صنعت سے متعلقہ تمام معاملات پر پورا عبور حاصل ہو گیا ہے، اور اس طرح مِن حیث الکل مالیاتی اور معاشیاتی معاملات میں بھی۔

چوں کہ وہ شرعی عدالت کے چیف جج تھے اس لیے میں ان سے اسلام کے قوانین کی روشنی میں بیمے کی حیثیت کے بارے سوال کرنے سے خود کو نہ روک سکا مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس تناظر میں بھی وہ ایک وسیع ذہن کے مالک نکلے۔ میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ ادب اور مطالعے میں ان کی گہری دل چسپی کیا ان کو کبھی مذہبی کتب کی طرف بھی راغب کرتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ تاریخ کے علاوہ، جو ان کا مرغوب موضوع رہا ہے، وہ تصوف میں بھی دل چسپی رکھتے ہیں مگر اسلامی قسم کے تصوف میں۔ میں خود بھی تصوف میں دل چسپی رکھتا ہوں، اور پھر ہم دونوں اسی موضوع پر گرما گرم مباحثے میں مشغول ہو گئے۔

انھوں نے کہا ''میں نے تصوف کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گرمجوشی ان صوفیا کی تاریخ پڑھنے سے پیدا ہوئی جو اسلامی دور میں فارس سے ہندوستان آئے تھے۔ اور اگر آپ ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ وہ تصوف کے اصلی معنوں میں صوفی نہیں تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں زُہد اور دنیاوی معاملات سے دوری کے جذبات کی تجسیم تھے۔ آپ انھیں خالصتاً تبلیغی نہیں بلکہ عملی طور کے مبلغین کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی بات میرے لیے دل چسپی کا باعث رہی ہے۔ اسلام کی تاریخ بھی وہی ہے، میں جس کا پُرزور داعی ہوں، جو انسان کو باعمل انداز میں جینا سکھاتی ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے جو آپ کو دنیا سے دور لے جاتا ہو۔ درحقیقت ہمارے پیغمبر کی زندگی ہمیں مکمل طور پر عملی زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ عملی زندگی گزارنے کے بعد ہی انھوں نے دنیا کو متاثر کیا تھا۔ ہر مسلمان کو ایک طرح سے مُلّا ہونا پڑتا ہے۔ اسلام میں ایک ادارے کے معنوں میں ملّائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ اس لفظ

'بنیاد پرستی' ہی کو لے لیجیے جس نے اس دور میں کتنی غلط فہمی پھیلائی ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنے دوستوں اور دوسرے لوگوں سے بہت بار باتیں کی ہیں، خصوصاً ان لوگوں سے جن کا تعلق مغرب سے ہے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ 'بنیاد پرستی' سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر اس سے آپ کا مطلب مذہب کے اصولوں سے منسلک ہونا ہے تو میرے خیال میں ہر ایک کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے منسلک ہونا ہی پڑے گا، کم از کم اس صورت میں جب وہ مذہب پر عمل کر رہا ہو، ہے کہ نہیں؟ اور ہمیں اس پر فخر ہوگا۔ مگر آپ بنیاد پرستی کو دہشت گردی کے برابر سمجھنے لگیں گے تو یہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہوگا۔ اس لیے کہ دہشت گرد تو کسی بھی قسم کے مذہب کے ہو سکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ضرورت کے پیشِ نظر کوئی بھی بنیاد پرست نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہمارا مذہب ہمیں ہمہ وقت جستجو میں رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح کہ آپ ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر اسلام کے اُصولوں کو سمجھنے یا منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ تو آپ ایسے مرحلے پر ہوتے ہیں جہاں کبھی نہ ختم ہونے والے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ گویا ایک صوفی کے بنیادی اصول یہی ہوتے ہیں کہ وہ حالات کو ان کے موجودہ تناظر میں دیکھتا رہتا ہے، وہ ماضی سے کبھی نہیں الجھتا۔ قرآن کو آپ جتنا زیادہ پڑھیں گے وہ اتنا ہی آپ کو تحقیق اور سائنس کی طرف راغب کرے گا۔''

میں ان سے اس بات پر متفق نہیں ہو سکا اس لیے کہ قرآن کے بارے میں میرا علم اتنا مبتدیانہ ہے کہ اس کی مدد سے اس موضوع پر کوئی با مقصد بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود میں آسانی سے ان کے بنیادی یقین اور اصولوں کا احاطہ کر سکتا ہوں اور مجھے ان سے اتفاق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

یہ ظاہر ہے کہ جسٹس محبوب پکّے مسلمان ہیں۔ انھوں نے حج بھی کیا ہے اور کئی بار عمرے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی اصولوں پر یک گونہ سخت کاربندی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے بہت سے مذہبی معاملات پر بھی لکھا ہے، اسی طرح جیسے وہ قانونی موضوعات پر، بیمے کے اور دوسرے عام موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو لوگوں کی توجہ اور توصیف کا مرکز بنا ہے، 'اسلامی مملکت میں عدلیہ کا کردار' کے عنوان سے ان کا مضمون یونی ورسٹی لا کالج کے مجلّے میں شائع ہوا ہے جو اس موضوع پر ان کے علم کی گہرائی کا غمّاض ہے۔

جب ہم ان کے چیمبر میں ملے تھے ان ہی دنوں عساکرِ پاکستان کے ہاتھوں نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ فوج نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا ہو۔ ملکی عدلیہ کے ایک اہم نمائندے ہونے کے ناتے میں نے ان سے اس صورتِ حال کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ اور یہ بھی کہ کیا ملک کا نظامِ عدل اب بھی ریاست کا ویسا ہی اہم ستون ہے جو ہر قسم کا دباؤ برداشت کر سکے جیسا کہ وہ اس وقت سے کرتا رہا ہے جب سے یہ ملک وجود میں آیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ ''میں اس ملک کی عدلیہ سے دو عشرے سے زیادہ عرصے تک منسلک رہا ہوں۔ میں بہت طویل عرصے تک لاہور ہائی کورٹ کا چیف بھی رہ چکا ہوں، اور پنجاب اس ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس ملک کی عدلیہ کے اہلِ کاروں کے بارے میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی نمائندگی کرنے کے لیے بہت اچھے لوگ موجود ہیں اور یہ بھی کہ ان لوگوں نے عدلیہ کی آزادی کو بخوبی قائم رکھا ہے۔ مجھے یہ بھی کہنا چاہیے کہ ہماری کارگزاری پر کسی جانب سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ حال ہی میں یہی بات میں نے انگلستان، لندن میں اپنے ایک خطبے کے دوران بھی کہی ہے جو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، یونی ورسٹی آف لندن کی دعوت پر دیا گیا تھا۔ وہاں میں نے سامعین کو بتایا تھا کہ میری ملازمت کے پورے عرصے میں مملکت کے کسی بھی عضو کی جانب سے کسی قسم کا کبھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا ہے۔ ہماری عدلیہ آزاد رہی ہے، آزاد ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آزاد رہے گی۔ ہمارے فیصلے نظامِ عدل کی صلابت کا اظہار ہیں باوجود ان سب مشکلات کے جو یہ اپنے پورے عرصۂ حیات میں جھیلتی رہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ ہم اس سے بری رہیں گے۔''

جسٹس محبوب نے یہ سب کچھ ایک یقینِ کامل کے ساتھ، جس کا وہ اظہار کر سکتے تھے، کہا اور میں ایک بار پھر ان کے خلوص سے متاثر ہوا۔ ان کا اندازِ انکسار جس کے ذریعے وہ مجھ کو مطمئن کرنا چاہتے تھے، پوری طرح قائم تھا۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے مجھے اپنے ذاتی عقائد میں شریک ہونے کا موقع دیا اور ایک لمحے کے لیے میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ انھوں نے مجھ کو اتنی قربت کا شرف بخشا ہے۔ اس واقعے نے مجھے وہ وقت بھی یاد دلایا جب میں نے پاکستان کی چیف جسٹس کارنیلئس کے اپنے تجربے اور تصورات پر مبنی ارشادات سنے تھے جو انھوں نے اپنے مخصوص حلقۂ دوستاں اور مداحین کے سامنے بیان کیے تھے۔ میرے ایک دوست مجھ کو اپنے ساتھ اس محفل میں لے گئے تھے۔ مجھے وہ محفل یاد آ گئی جب جسٹس محبوب نے اپنے پیشے کی اخلاقیات کے بارے میں اپنے ارشادات کا اختتام یہ کہہ کر کیا کہ ”آپ صرف یوں ہی حکومتوں کے مخالف یا موافق تعصب نہیں رکھ سکتے۔ نہ کسی فرقے یا جماعت کے موافق، نہ اس کے مخالف۔ یہ صرف واقعات کے ظہور پر ہی مبنی ہونا چاہیے۔ اور اس بارے میں قبل از وقت سوچنا ایک جج کے لیے ممنوع ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ایک جج کو اپنے آپ کو ناوابستہ رکھنا چاہیے۔ اس قسم کے مقدمات کے دوران، جو اسمبلی کی تحلیل کے بارے میں تھے اور میں ان میں شریک تھا، میں نے اخبار کا مطالعہ اور ذرائع ابلاغ کی خبریں سننا بند کر دیا تھا۔ اس لیے کہ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھ پر ان کے یا اوروں کے بارے میں کچھ اثرات مرتسم ہونے لازمی ہیں۔ اس لیے بہترین طریقہ یہی تھا کہ اپنے آپ کو قطعی طور پر 'بند' کر لیا جائے۔ اور یہ طریقہ ہے فیصلے کرنے کا اس لیے کہ آپ کو حقائق کی بنیاد پر فیصلے کرنے ہوتے ہیں جو آپ تک بغیر کسی آلودگی کے آنے چاہییں۔ اور میں کہوں گا کہ یہی طریقہ اپنانا چاہیے“

نہ میں وکیل ہوں نہ میں نے کبھی جسٹس محبوب کو عدالتی کارروائی کرتے دیکھا ہے۔ مگر میں قائل ہوں کہ وہ ایک اچھے جج ہوں گے۔ میرے خیال میں ایسے انسان، میں جن پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ وہ بہت خلیق مگر مستقل مزاج آدمی ہیں، خوش اخلاق ہیں، انکسار کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں میں جسٹس محبوب کے دیے ہوئے فیصلے مختلف میدانوں، قانون کے اُصولوں کے لیے مستحکم بنیاد فراہم کرتے ہیں اور مجھے اس قول پر پورا اعتبار ہے۔

تعجب نہیں کہ جسٹس محبوب کو بارہا موقعوں پر بین الاقوامی مذاکروں اور کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ اور ان تہ در تہ مصروفیات کے باوجود وہ سماجی کاموں اور فیاضانہ کوششوں میں حصہ لینے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ ہلالِ احمر کی صدارتی کرسی پر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بھی ہیں۔ یہ ادارہ تقسیمِ ہند سے قبل غریب مسلمان طلبا کو سائنسی تعلیم کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔

جسٹس محبوب نے کثرت سے سفر کیا ہے اس لیے وہ سیاسی، سماجی اور معاشیاتی امور میں وسیع ذہن کے مالک ہیں جیسا کہ ان جیسے دانشورانہ صلاحیت والے انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنی نسل اور اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی امداد فراہم کرنے والے اداروں پر ملک کے انحصار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ اگر لوگ صرف بہتر تعلیم حاصل کر لیں اور بجائے قرض کے انھیں زیادہ تکنیکی علم فراوانی سے فراہم ہو سکے تو پاکستان جیسے ملکوں میں اور بہت کچھ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بڑے جذباتی انداز میں جسٹس محبوب نے کہا، ”دیکھیے، میں ذاتی سطح پر آپ سے ایک شعبے کے بارے میں بات کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ہم سے ٹیکنالوجی میں شرکت پر احتراز کرتے ہیں۔ یہ انداز ہمارے لیے حقیقی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی پر مغرب کی اجارہ داری ہے۔ مگر وہ انسانیت کی سطح پر ہمیں اس میں شریک نہیں کرنا چاہتے۔ اس حد تک کہ سائنس کے موضوعات، حتیٰ کہ طب کی نصابی کتابیں تک اتنی گراں کر دی گئی ہیں کہ ہمارے کم حیثیت طلبا ان کو حاصل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں مغرب سے بہت پیچھے رہے جاتے ہیں۔ بہت عرصہ قبل بیجنگ میں World Intellectual Property Organisation (WIPO) کے زیرِ اہتمام، جو اقوامِ متحدہ کا ایک مستقل ادارہ ہے، ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا اور میں نے اس میں اپنے ملک کی نمائندگی کی تھی۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ یہ دانشورانہ قزاقی،

ٹریڈ مارک کی خلاف ورزی، کتابوں اور ریکارڈوں کی جعلسازیاں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ لوگوں کے لیے ان کا حصول آسان نہ بنادیا جائے۔ اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو فطری نتیجہ وہی ہوگا جو آج آپ کے سامنے ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ بہت سی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو امریکا اور دوسرے جگہوں پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں اور وہ واپس نہیں آتے۔ اس لیے کہ ان کے لیے یہاں مواقع نہیں ہیں۔ اور یہ مواقع یہاں صرف اسی وقت مہیا ہو سکتے ہیں جب ٹیکنالوجی درآمد کی جائے اور یہاں اسی قسم کے تکنیکی ادارے قائم کیے جائیں۔ تحقیق کے لیے ضرورت کے مطابق ہمیں سرمایہ فراہم نہیں ہے۔ اور اس سے زیادہ خرابی اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جو کچھ سرمایہ ہے وہ بھی اس لیے صحیح طرح استعمال نہیں ہوسکتا کہ ہمارے پاس تحقیق کرنے والے تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے۔ تو ایک مسئلہ ملک سے ذہانت کے اخراج کا ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ 'ہائی ٹیک مشینیں' بے حد وحساب گراں ہیں کہ ہمارے ملک ان کو خریدنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس ہمارا خام مال اتنی کم قیمتوں پر خریدا جاتا ہے کہ اتنی زیادہ قیمتوں پر ٹیکنالوجی خریدنے کے لیے ہمارے پاس ضروری زرِ مبادلہ نہیں ہوتا۔"

بلاشبہ، پاکستان کے معروضی حالات میں جسٹس محبوب یہ کہنے میں حق بجانب تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ان مسائل سے پوری طرح واقف بھی تھے جو تمام ترقی پذیر ممالک میں ہر سطح پر موجود ہیں اور یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ ان قابلِ افسوس حالات کا ذمے دار کون ہے۔ اور اگرچہ ہم دونوں کو ان باتوں سے اتفاق کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، میں نے مناسب جانا کہ میں ان کے مشاہدات اور بحث میں دیے جانے والے دلائل کے اقتباسات پیش کردوں اس لیے کہ یہ ان کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں، میں نے جس کا ایک مختصر خاکہ اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے مگر مجھے امید ہے کہ قارئین اس انسان سے واقف ہوسکیں گے جس نے اپنی تمام زندگی اس دنیا کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے جو ہر روز نت نئے روپ میں ہمارے سامنے خود کو پیش کرتی ہے۔

میرے دوست روشن علی بھیم جی جسٹس محبوب کا بہت احترام کرتے ہیں اور یہ میں اب سمجھ سکا ہوں کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔

# اشرف تابانی

## سندھ کے ہمارے گورنر

ہماری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ اُن ہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو نے، بیمہ زندگی سمیت، بہت سی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ میں مختصر عرصے کے لیے کراچی آیا ہوا تھا اور قمر ہاؤس میں روشن علی بھیم جی نے ان سے میری ملاقات کرائی تھی۔ اشرف تابانی ان ہی دنوں راولپنڈی سے واپس آئے تھے۔ بھٹو نے ملک کے بہت سارے سربرآوردہ صنعتکاروں کو ملاقات کے لیے بلایا تھا اور تابانی صاحب فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کے صدر کی حیثیت میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ میٹنگ نیشنل ڈیفنس کالج میں ہوئی تھی جس سے بھٹو نے خطاب کیا تھا۔ تابانی صاحب نے بھی کاروباری برادری کی طرف سے زوردار تقریر کی تھی اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے عمل کی کُھل کر مخالفت کی تھی۔

تابانی صاحب سے میری اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، اس لیے کہ وہ ای ایف یو لائف کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ تابانی صاحب نے بتایا کہ ''راولپنڈی کے اس اجتماع میں کراچی سے بہت سارے لوگ جانا چاہتے تھے مگر پی آئی اے کی عام طور پر جانے والی پروازوں میں سیٹ نہیں مل رہی تھی، تو ہم لوگوں نے پورا ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا، راولپنڈی گئے بھی اور اسی شام کراچی واپس بھی آگئے تھے۔ ہماری کراچی واپسی سے قبل ہی صدر (بھٹو) کی اور میری پوری تقریریں ٹیلی وژن پر نشر ہو چکی تھیں اور پورے ملک سے لوگوں کے تعریفی ٹیلی فون آنے شروع ہو گئے تھے۔ میرے بے لاگ تبصرے کو بالخصوص پسند کیا گیا تھا۔''

۵ رمارچ ۱۹۷۲ء کی اس تقریر میں، بہت سی باتوں کے علاوہ، تابانی صاحب نے مندرجہ ذیل باتیں بھٹو صاحب کے گوش گزار کی تھیں: ''حکومت نے بہ جبر مختلف صنعتوں پر مشتمل بتیس نجی اداروں کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ مجھے صاف الفاظ میں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ حکومت کا یہ عمل نجی غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے ایک دھچکا ثابت ہوگا اور ساتھ ہی ہماری اپنی کاروباری ہنرمندی بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔ نجی شعبہ ان اداروں کی انتظامیہ کو قبضے میں لیے جانے کے پیچھے کارفرما عوامل کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس بات کا کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ ناتجربے کار افسران اِن جیسے اداروں کو اعلیٰ درجے کے اُن ہنرمند ڈائریکٹروں کے مقابلے میں بہتر طور پر چلاسکیں گے، جنھوں نے ان کی بنیاد رکھی تھی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان اداروں کے بہت سے مسائل ان عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں کہ نجی شعبے کے منتظمین کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ کچھ مسائل تو اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ ماضی کی حکومتوں کا طریقۂ کار صحیح نہیں تھا جس کے لیے نجی شعبے کو ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ان میں سے کچھ ادارے تو درمیانے درجے کے ہیں اور ان کے قومی ملکیت میں لیے جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔''

اشرف تابانی ۱۹۳۰ء میں برما کے شہر رنگون میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کپڑے کے بیوپاری تھے اور یعقوب احمد برادرز کے نام سے ان کا ایک ادارہ کام کر رہا تھا جس کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں رکھی گئی تھی۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا تابانی صاحب صرف دو برس کے

تھے۔ ان کے سات بھائی اور ایک بہن تھی جن میں سے دو بڑے بھائیوں نے خاندان کا بوجھ سنبھالا تھا۔ اشرف نے ابھی اسکول جانا شروع ہی کیا تھا کہ مسلم — برمی فسادات شروع ہوگئے اور جان بچانے کے لیے ان لوگوں کو رنگون چھوڑنا پڑا۔ یہ لوگ ایک کشتی میں سوار ہو کر انجانے سفر پر روانہ ہوئے اور بالآخر بمبئی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی نے بمبئی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

اشرف تابانی بچپنے ہی سے جناب روشن علی بھیم جی سے واقف تھے۔ تابانی صاحب کے سب سے بڑے بھائی روشن علی بھیم جی کے ایسے اچھے دوست تھے کہ ان کی تصویر ان کے بھائی کی لکھنے پڑھنے کی میز پر ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ تابانی صاحب کی مسٹر بھیم جی سے شناسائی بمبئی آکر بڑھی اس لیے کہ وہ بھی بیمے کا کاروبار کرتے تھے۔

قمر ہاؤس میں ایک بورڈ میٹنگ کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تابانی صاحب نے اپنی یادداشتوں کو کھنگالتے ہوئے کہا، ''ہم بمبئی کے مضافات کے ایک پُرسکون اور خوب صورت علاقے میں رہتے تھے اور سیٹ زیویر اسکول جانے کے لیے مجھے ریل کی سواری لینی پڑتی تھی۔ اسکول ہمارے خاندان کے کاروبار کے دفتر کے بالکل قریب تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے اپنے دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ روشن بھائی وہاں اکثر آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمارے بڑے بھائی کے ساتھ، جو اُن کے بہت اچھے دوست تھے، کھانا بھی کھاتے تھے۔''

۱۹۴۷ء میں ان کے خاندان نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا اور کراچی میں جا بسے، جہاں اشرف تابانی صاحب نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ تابانی صاحب ۱۹۴۸ء میں امریکا چلے گئے جہاں فلاڈلفیا کالج آف ٹیکسٹائلز اینڈ سائنس میں داخلہ لے کر ٹیکسٹائل انجینیرنگ میں بی ایس سی کیا۔ ۱۹۵۲ء میں کراچی واپسی پر انھوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ خاندان کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔

ان کا 'بائیوڈاٹا' بہت اچھا دکھائی دیتا ہے۔ آج کل وہ سیری (SERI) شوگر ملز کے چیئر مین، ایمپلائرز فیڈریشن آف پاکستان کے صدر، انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف ایمپلائرز، جینیوا کے صدر، گورننگ باڈی آف دی انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن، جینیوا کے ممبر، پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن (سدرن زون) کے صدر اور ای ایف یو لائف کے ڈائریکٹر ہیں۔ اتنی ساری ذمے داریاں ان کی دل چسپیوں اور ان کے ہمیشہ مضطرب رہنے والے دماغ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی متحرک شخصیت اور محبتوں بھرے دل نے، ملک اور بیرونِ ملک، انھیں بہت سارے دوست فراہم کیے ہیں۔ بات چیت کرنے اور صائب مشورے دینے کے لیے دوستوں میں ان کی بہت مانگ رہتی ہے۔

وہ بہت سے اعلیٰ درجے کے حکومتی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ تین برس کے عرصے کے لیے حکومتِ سندھ میں مالیات، صنعت، آبکاری اور محاصل کے وزیر رہے۔ تقریباً دو برس کے لیے انھیں سندھ کے گورنر کے فرائض بھی سونپے گئے تھے۔ تابانی صاحب ہر بات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینے کے عادی ہیں اس لیے کہ ان کے اندر ہمیشہ ایک متوازن دماغ کی فرمانروائی رہتی ہے۔ ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں اور ان کو جلد غصہ نہیں آتا۔ ان سے میں نے سوال کیا کہ کیا وہ بنیادی طور پر ایک سیاست داں ہیں، تو جواب دینے سے پہلے، اپنی عادت کے مطابق انھوں نے طویل تامّل کیا اور بولے، ''میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ میں نے کبھی کسی پارٹی کے لیے انتخاب لڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر میں بہت سے اعلیٰ درجے کے سیاست دانوں کے ساتھ کام کرنے میں بہت اچھا ہوں۔ مجھے حکومت کے عہدوں پر کام کرنا اچھا لگا ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبے کے بہت سے لوگوں سے میری شناسائی ہوئی ہے۔ اس میں مجھے لطف بھی آیا اور کبھی کبھی الجھن بھی ہوئی، اس لیے کہ ایسے عہدوں پر ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی ہوتا دیکھنا پڑتا ہے جس کو دل پسند نہیں کرتا، جو غلط ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت سے لوگوں کا قتل ہونا، جس کے لیے آپ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ پولیس کے سربراہ کو حفاظتی اقدام بڑھانے کے لیے کہیں۔ اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ سرکاری افسروں کو سیاست میں گھسیٹنا ہے۔ ایوب خان کے دور میں اس کی ابتدا ہوئی تھی جب مارشل لا کے افسروں نے کئی اعلیٰ عہدے کے سرکاری افسروں کو برطرف کر دیا تھا۔ مارشل لا کے افسروں نے

رکاری افسروں کی ملازمت کے تحفظ پر سوالات اٹھائے تھے۔ ایک بار آپ انتظامیہ کو سیاست میں گھسیٹ لائیں تو سیاستداں سرکاری محکموں
یں دخیل ہونے لگتے ہیں۔ یحییٰ خان اور بھٹو کے دور میں یہی کچھ ہوا تھا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔"

اشرف تابانی فطرتاً پُر امید انسان ہیں اور اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر انسان محنت کرے تو بڑے سے بڑے معرکے سر کر
سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے سندھ میں اپنی شوگر مل کا قصہ سنایا۔ "چار برس سے میری شوگر مل کامیابی سے چل رہی ہے۔ جب میں نے
ندرونِ سندھ اس علاقے میں شوگر مل لگانے کا ارادہ کیا جہاں اُن دنوں ڈاکوؤں کا راج تھا تو میرے جاننے والوں نے مجھے پاگل جانا۔ میں
نے کہا تھا کہ ڈاکو تو آتے جاتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ ایک دن آئے گا جب پھر قانون کی حکمرانی ہوگی، ورنہ ہم میں سے کوئی
اقی نہیں رہے گا۔ اور اگر ہم باقی نہیں بھی رہتے تب بھی مل لگانے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔ اس لیے ہمیں مل لگانی چاہیے۔ اور اگر ہم باقی
ہے تو یہی مل سیکڑوں لوگوں کے لیے روزی کا ذریعہ ہوگی۔ اس کی مدد سے ہر برس کم از کم دو ہزار کاشت کاروں کو آمدنی ہوگی۔ اس طرح ہم
س علاقے کے بہت سے خاندانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ مل نہیں لگاتے تو ہر رات ہمیں یہ روشنیاں نہیں دکھائی دیتیں۔ اس سے
بل یہاں کتنا اندھیرا ہوتا تھا۔ لوگ اس علاقے میں جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ اب کم از کم لوگ خوف تو نہیں کھاتے۔ یقین کیجیے،
اکستان میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا کوئی علاج نہ ہو۔"

مجھے ان کا یہ انداز اس لیے پسند آیا بھی کہ "میرے خیال میں اس ملک کے پڑھے لکھے لوگ بہت زیادہ خود تنقیدی کے عادی ہیں۔
ہ اپنی ناکامیابی کی وجوہات تلاش کرنے میں بہت عجلت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کام بگڑتے ہیں،
گرچہ وہ اس کے ذمے دار نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے ہدف بناتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے میں ناکامیاب ہونے پر الزام تراشی کرتے
یں۔ میں ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ذرا صبر سے کام لیں، پُر امیدی کا مظاہرہ کریں، اپنی صلاحیتوں پر زیادہ اعتماد کریں
ور اس بات پر فخر کریں کہ انھوں نے پچاس برسوں کے قلیل عرصے میں کیا کچھ حاصل نہیں کر لیا ہے۔" مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ
تابانی جیسے لوگ میرے تصورات اور تیقّن سے اتفاق کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ "اگر لوگ ایک قوم کی حیثیت میں اپنی کامیابیوں کا اعتراف شروع کر دیں، بجائے یہ کہ اس کے برعکس محض دیکھتے
ہیں، تو حالات بدرجہا بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے سوچنے کے انداز کو تبدیل کرنا ہوگا۔ یہ ملک دراصل ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی
بہتری کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسی ہدف کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو یہ
کہتا ہے کہ ہم وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے جس کی ہمیں ضرورت تھی، وہ ضرورت سے زیادہ پُر امیدی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یا پھر واقعی وہ صحیح ہے۔
س کا یہ مطلب نہیں کہ دراصل ہم وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں باون برس کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا۔ قوموں کی بلوغت
کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ پاکستان جیسے محنت کرنے والے عوام، ان کی جیسی دوسری، تیسری پڑھی لکھی اور زیادہ روشن
خیال نسلوں کے ہوتے ہوئے پاکستان کا مستقبل خاصا درخشاں دکھائی دیتا ہے۔"

جو کچھ تابانی صاحب نے فرمایا، میں نے اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے، مگر جاتے جاتے آخری سوال ضرور کیا تھا کہ
"تابانی بھائی، جب کبھی آپ پلٹ کر اپنی سیاسی ذمے داریوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کس بات یا کس کام پر آپ کو زیادہ فخر محسوس ہوتا ہے؟ اس
بار ان کا جواب، ایک لحظہ بھی توقف کے بغیر، غیر معمولی طور پر فوراً آ گیا تھا۔ انھوں نے فرمایا، "مجھے سندھ کی گورنری بہت اچھی لگی تھی اس لیے
کہ اس کے ذریعے مجھے ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں سے قربت کے مواقع ملے تھے۔ دو کروڑ تیس لاکھ انسانوں میں پہلا آدمی ہونا، نہ
صرف بڑی بات معلوم ہی نہیں ہوتی، دراصل ہوتی ہے۔ اس لیے اور بھی کہ اس طرح نہ صرف لوگوں کی خدمت کرنے کے زیادہ مواقع ملتے
ہیں بلکہ خدمت کے ساتھ انکسار کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دوست روشن علی بھیم جی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی

بڑی خاکساری سے گزاری ہے۔ میں نے انھیں بمبئی میں بھی اسی طرح دیکھا تھا، اور پاکستان کے ابتدائی دور میں بھی اور اُس وقت بھی جب وہ ای ایف یو جیسی عظیم کمپنی کے چیئر مین کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے مگر ان کے اندازِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے رہن سہن میں اس قسم کے انکسار کو دیکھ کر ہی، ملک میں یا ملک سے باہر کے لوگ، ان سے دوستی کے خواہاں ہوتے تھے اور جینے کا قرینہ سیکھتے تھے۔ روشن علی بھیم جی وہ انسان تھے جو زندگی کی اصل قدروں کے محافظ تھے۔ انھیں فنون سے بھی محبت تھی۔ بمبئی کے قیام کے وقت ہی سے وہ سر برآوردہ فنکاروں سے محبت کرتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے فنکاروں میں سے ایک، سہگل، جو اداکار بھی پائے کے تھے اور گلوکار بھی، روشن علی کے بہت اچھے دوست تھے۔ آپ نے خود دیکھا ہے کہ پاکستان میں بھی پائے کے شعرا نہ صرف ان کے دوست تھے بلکہ اِن کے گھر اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ صرف معاشرے میں اپنا قد بڑھانے کے لیے وہ دوستیاں نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان کی دوستی خلوصِ دل سے ہوا کرتی تھی۔ نجی شعبے میں ای ایف یو کے چیئر مین جیسے بڑے عہدے پر پہنچنے کے باوجود ان کا رہن سہن بہت سادہ ہوا کرتا تھا۔‘‘

شاید یہ صرف انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا احترام ہی تھا جس نے روشن علی بھیم جی کے دل میں زندہ رہنے کی ایسی زندہ تمنا پیدا کی تھی کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں بھی، ۱۹۹۲ء میں، انھوں نے زندگی کی بیمہ کمپنی بنانے کا بیڑا اٹھایا تھا، جس میں ڈائریکٹر کے طور اشرف تابانی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔

EFU Group Insurance For Ghandhara

Group in Gha[…]

Picture shows Captain Gohar Ayub Khan, MNA, Managing Director, Ghandhara Industries Ltd. signing the agreement (extreme right). On his right is Mr. S. M. Moinuddin, General Manager, Eastern Federal Union Insurance Company Ltd. Standing from left to right are Mr. A. M. A. Burt, Asstt. Manager, Eastern Federal, Mr. S. A. Walajahi, Secretary, EFU and Mr. H. S. Mufti, Secretary, G.I.L.

A Group Term Insurance […] the Bank of Bahawalpur Ltd. […] Eastern Federal Union Insurance Company Ltd. […] life insurance cover has been provided to the officers and employees of the Bank at a very nominal premium. Picture shows Mr. Humayun Sadiq, General Manager, Bank of Bahawalpur and Mr. S. A. Walajahi (left) Secretary, Eastern Federal Union Insurance Company Ltd. signing the contract.

Mr. Mumtaz Hasan, signing the agreement. On his left Mr. Roshan Ali Bhimjee, Mr. Ghulam Mohiuddin is on the right of Mr. Mumtaz Hasan. Extreme left is Mr. Abdul Aleem.

NBP-EFU GROUP INSURANC[E]

Karachi:- Mr. Mumtaz Hasan, Managing Director, National Bank of Pakistan and Mr. Roshan Ali Bhimjee, Managing Di[…]

United Bank, Signs with E.F.U

A group Term Insurance agreement was signed be[tween] United Bank Limited and the Eastern Federal Union I[n]surance Company Limited on August […] at Karachi. Under this agreement more than […] employees of the bank from the President to the ordinary […] have been […] insured. Picture shows […] A. S. Hafiz […] President (Personnel) United Bank and M[…] […], General Manager (General) EFU signing […]

National Bank employees group insurance

By Our Staff Correspondent

All employees of the National Bank of Pakistan, including officers, will be covered under a group insurance policy, taken […]

Group Term Insurance Contract was signed recently by Mr. Hashmatullah Khan, Chief of Administration Division of Civil Aviation and Mr. S.A. Walajahi, Secretary, Eastern Federal Union Insurance Company Ltd., under which insurance cover has been provided to the officers and staff of the Department at a nominal cost during the subsistence of […]

١٩٦٧ء - ترقی اور معاہدوں کا سال

روشن علی بھیم جی

ای ایف یو کا کلکتہ میں پہلا دفتر ۱۹۳۲ء

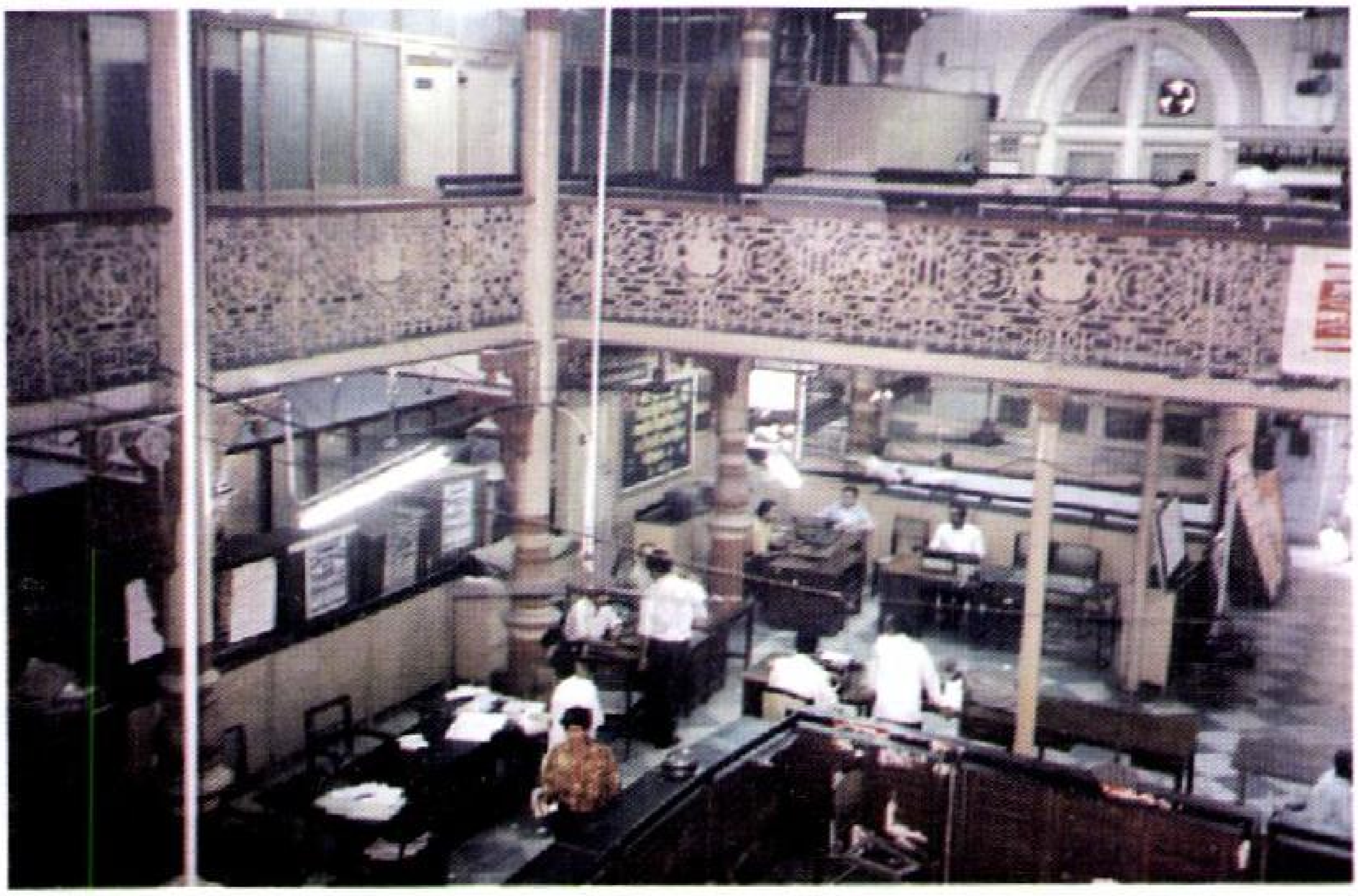

۳۲۔ ڈلہوزی اسکوائر کا اندرونی منظر۔ یہ تصویر ۱۹۹۸ء میں لی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس بلڈنگ میں اس زمانے سے جب یہ ای ایف یو کا مرکزی دفتر بنی تھی، اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے

۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۳ء تک میونخ ری انشورنس کمپنی کے بورڈ آف مینجمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر ہورسٹ جانوٹ

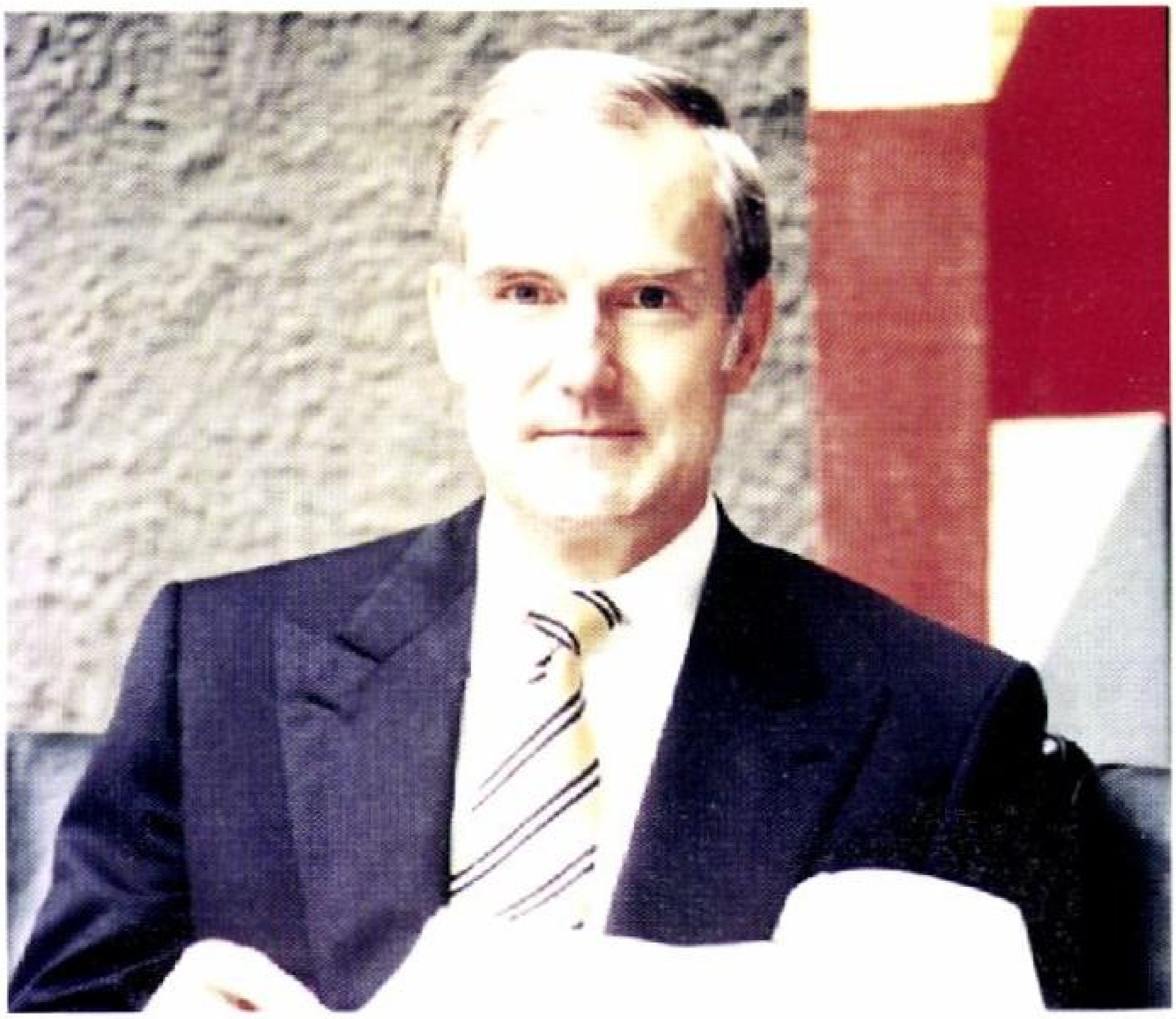

میونخ ری انشورنس کمپنی کے بورڈ آف مینجمنٹ کے حالیہ چیئرمین ڈاکٹر ہینز جورجین شنزلر

نوابینِ بھوپال کی آخری شہزادی محترمہ عابدہ سلطانہ ہندوستان کی پہلی خاتون پائلٹ بننے کے پچاس برس
پورے ہونے پر سندِ اعتراف وصول کرتے ہوئے

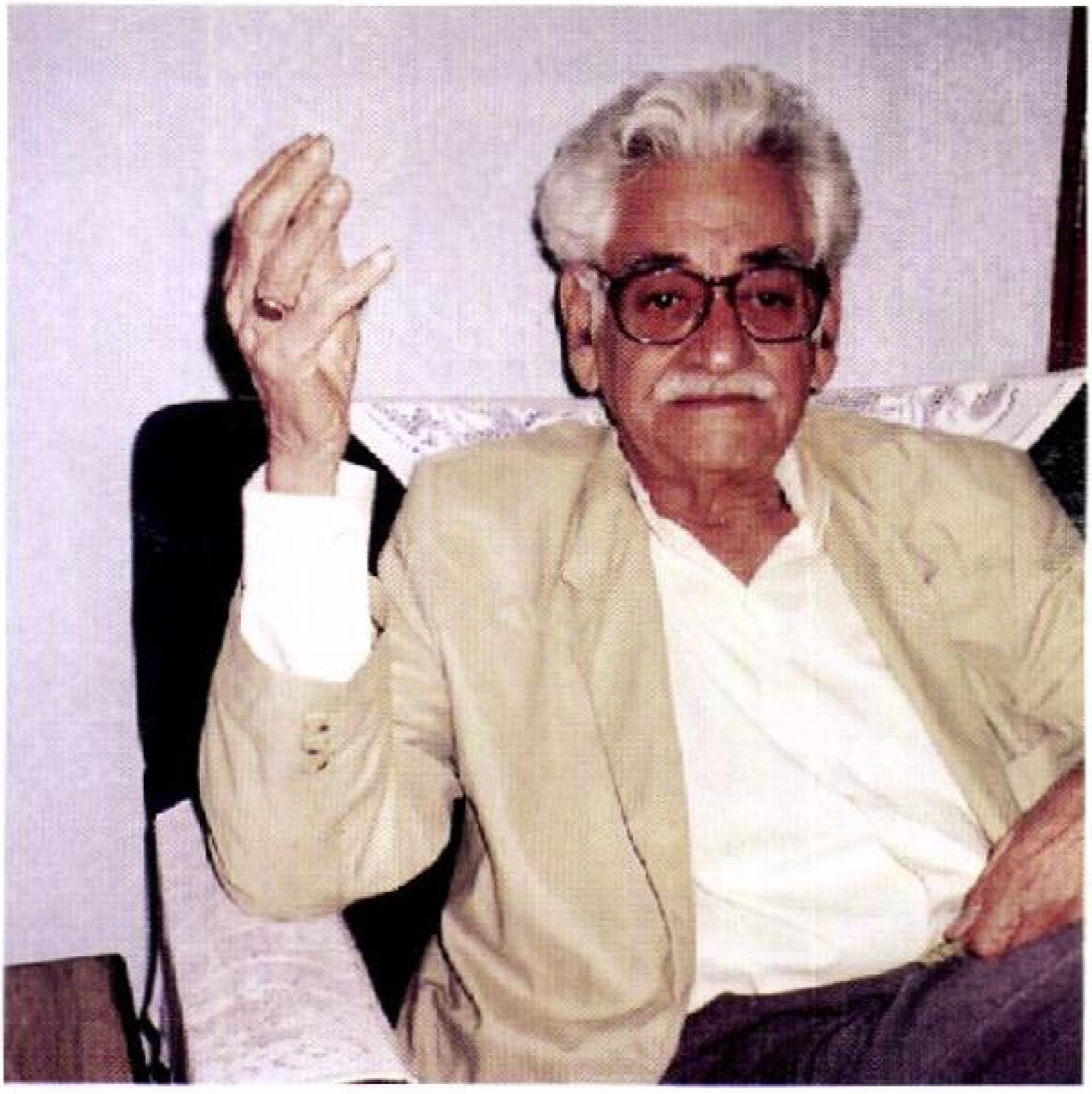

مرزا احمد اصفہانی کے بڑے صاحبزادے صدری اصفہانی مارچ ۱۹۹۸ء میں اپنے ڈھاکا کے دفتر میں

ابوالحسن اصفہانی کی بیوہ، بیگم غامر اصفہانی

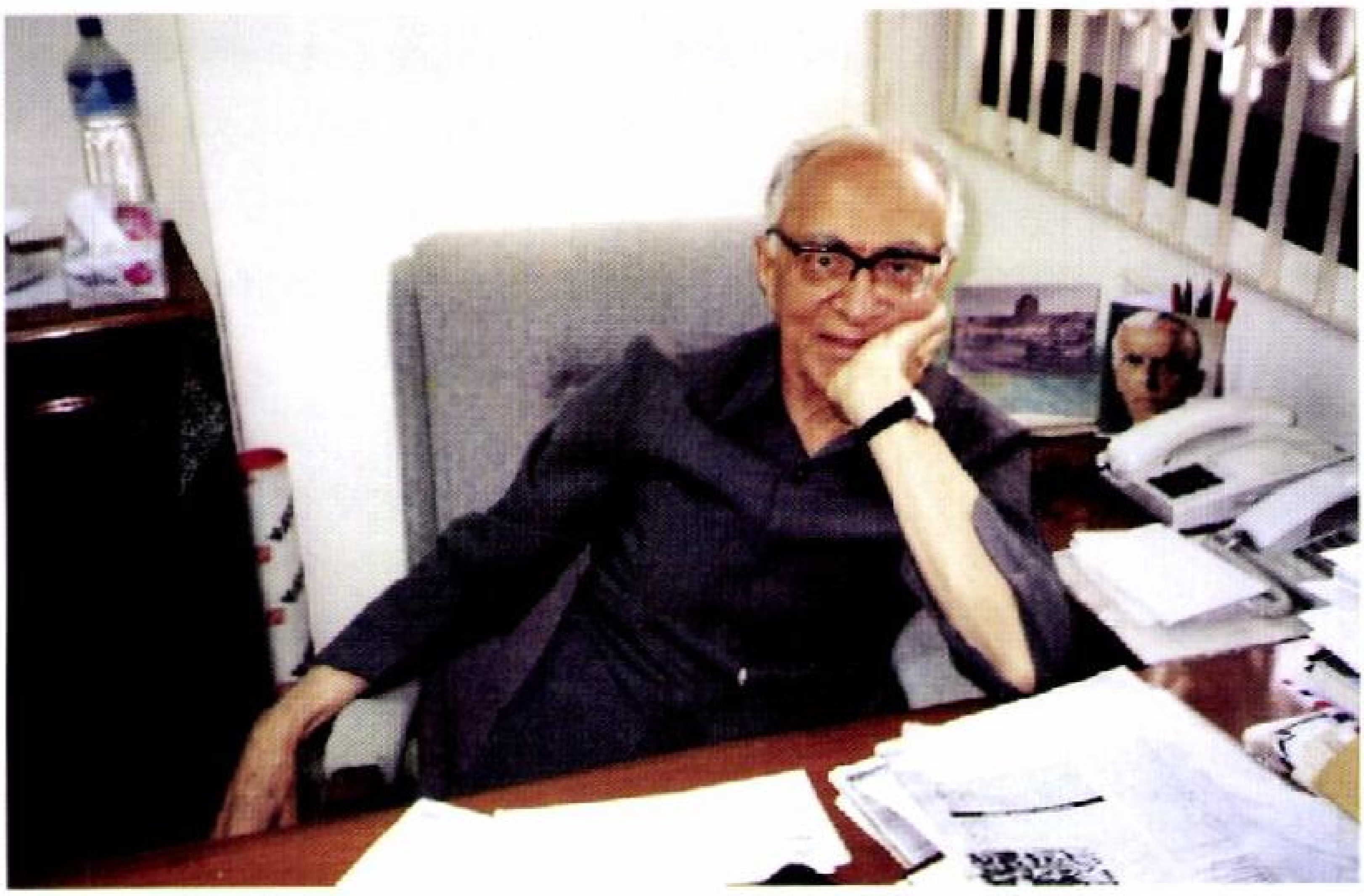

عبدل الرحمٰن حاجی حبیب (مٹھو) ۱۹۹۹ء میں اپنے قمر ہاؤس کے دفتر میں

سندھ کلب میں سعید احمد اور ان کی اہلیہ کتاب کے مصنف اور ان کی بیگم کے ساتھ

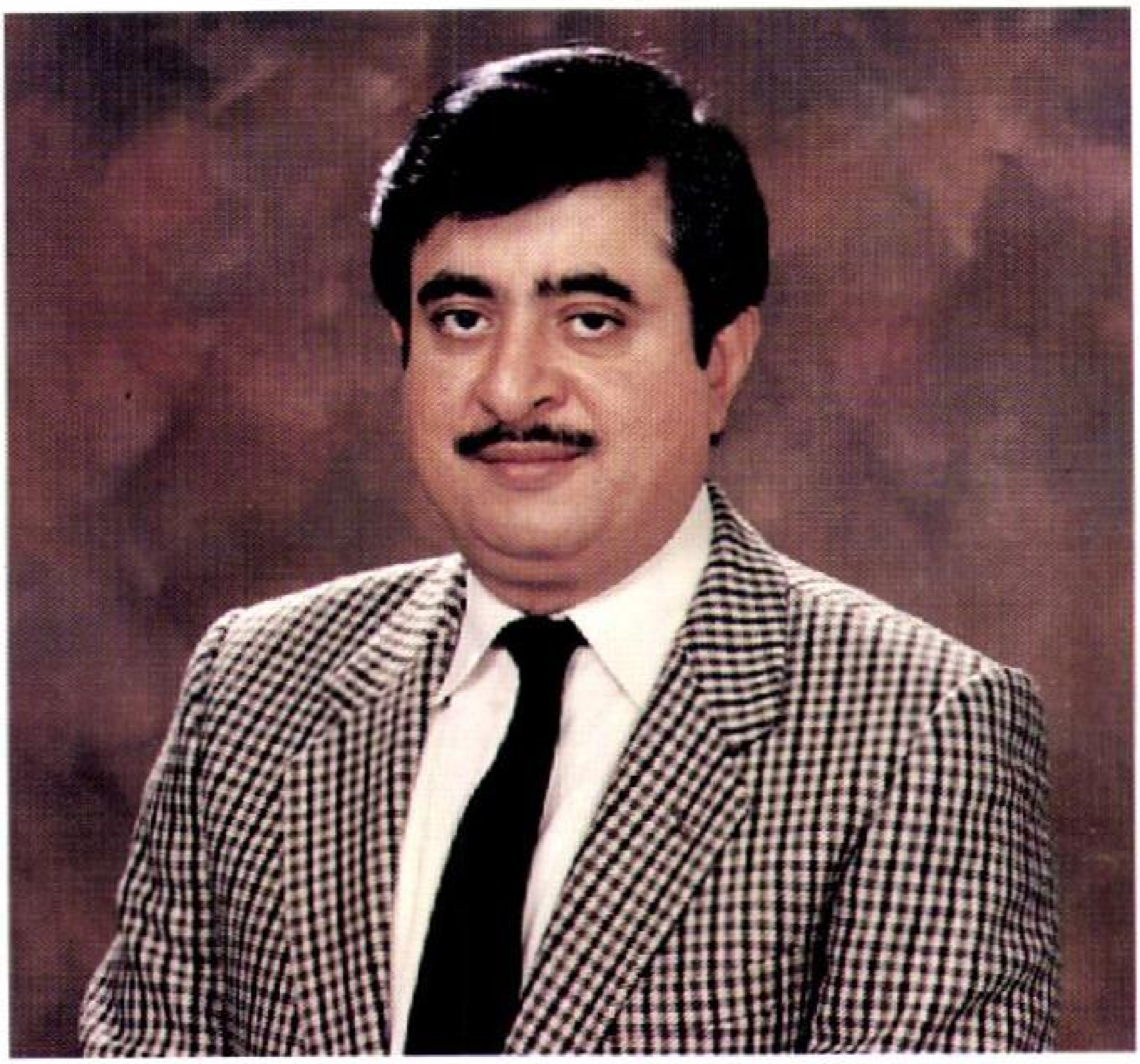

ای ایف یولائف اور ای ایف یو جنرل کے ڈائریکٹر جہانگیر صدیقی

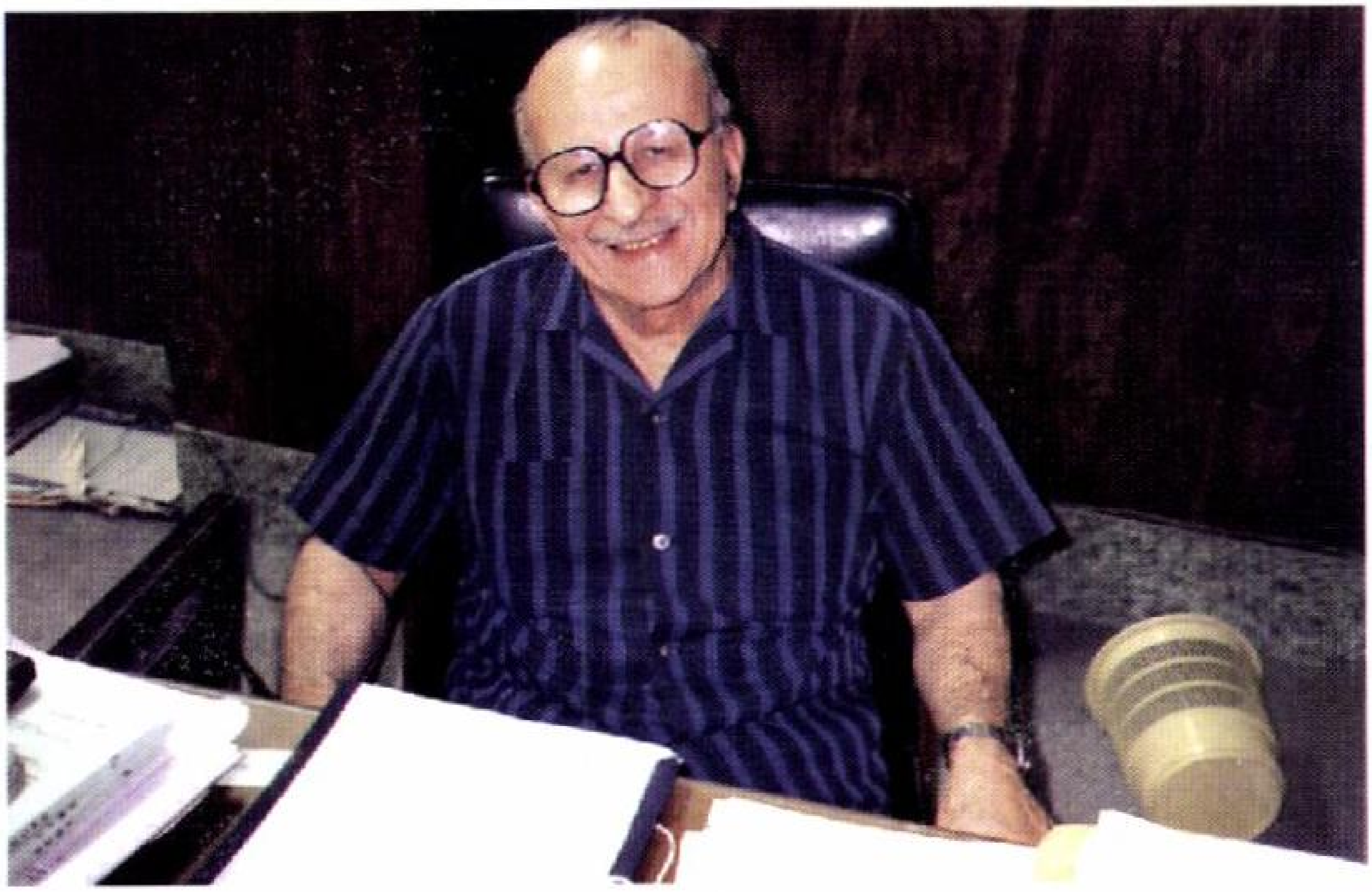

۱۹۹۸ء میں محمد علی سعید اپنے دفتر میں

جسٹس میاں محمد محبوب، ۱۹۹۸ء

اشرف ڈبلیو تابانی، ۱۹۹۹ء

# عظیم شراکت دار شخصیات

اِروِن سی آئیون

ایس ایم معین الدین

میاں سعید احمد

ایس ایف عالم

ساجد زاہد

عظیم رحیم

ڈاکٹر محمد سعید خان

ایس اے رشید

مرزا فیض احمد

ابا علی یوسف

ڈاکٹر تاج الدین منجی

طاہر ساچک

خدا بخش

ہائنز شوارز

سید سبطِ حسن

ایس اے والا جاہی

نواب حسن

سلطان احمد

ابو المحمود

محمود جعفری

محمد حسین علوی

ایم فصیح الدین

حسن علی عبداللہ

سیف الدین زومکاوالا

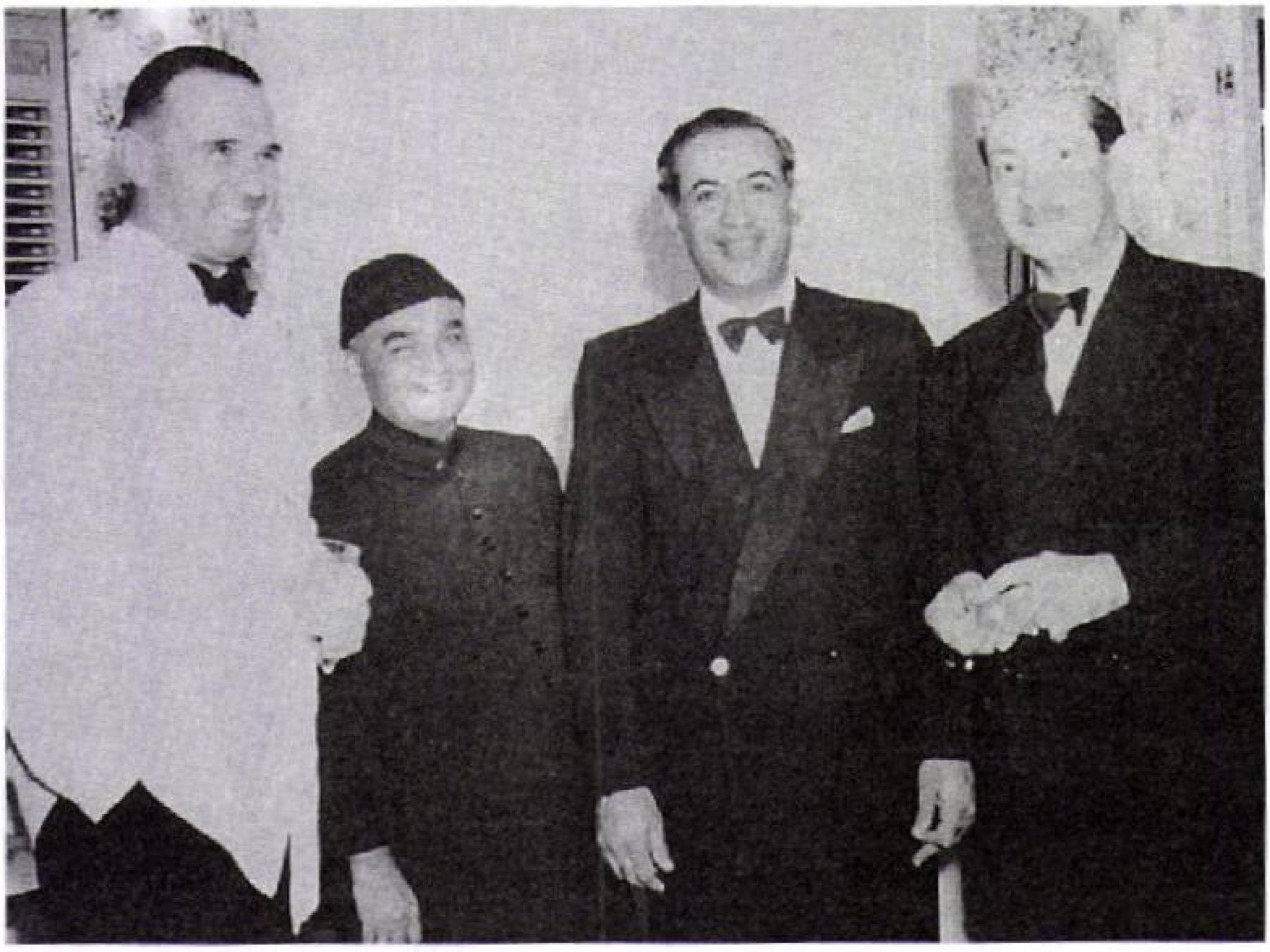

ای ایف یو کے جنرل منیجر ای سی آئیون، ایس ایم معین الدین، ایم وصال الدین اور ٹی بیکسٹر کے ساتھ
(اندازاً ۱۹۵۰ء)

ایس ایم معین الدین ہوٹل میٹروپول میں ای سی آئیون اور ان کی بیگم کے اعزاز میں منعقدہ الوداعی تقریب سے
خطاب کرتے ہوئے۔ (دائیں سے) مسز از ابیلا خان، مسز آئیون، کے ایف حیدر، ای سی آئیون اور مسز گالینا شوارز

ای سی آئیون اوران کی بیٹی بار براتی بیکسٹر کو جرمنی میں استقبالیہ دیتے ہوئے

۱۹۶۷ء کے ای ایف یو کونشن میں شرکت کے لیے آمد پر خدا بخش ڈھاکا ائیرپورٹ پر
ای سی آئیون کا استقبال کررہے ہیں

# اِروِن سی آئیون

## جرمنی کا رابِن ہُڈ

اِروِن ۱۹۰۷ء میں جرمنی کے ایک درمیانے درجے کے شمالی شہر ہینووَر Hannover میں پیدا ہوئے اور ہیمبرگ میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ ہیمبرگ Hanseatic League (جرمنی کے ساحلی شہروں کا ایک تجارتی گٹھ جوڑ جو ۱۲۴۱ء میں قائم ہوا تھا اور اُنیسویں صدی تک رہا) ایک اہم رُکن تھا۔ اِروِن سی آئیون کا ہمیشہ سے اس مخصوص شہر سے اپنے ابتدائی رشتے اور اس کے شان دار ماضی سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے والد بھی، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک مشہور جرمن آبدوز کے چیف انجینئر تھے، اس قسم کے جذبات رکھتے تھے۔ یہ آبدوز جرمنی اور برطانیہ کے درمیان بحری جنگ میں شامل تھی اور اس کو بڑی شہرت ملی تھی۔ یہ کشتی جرمنی کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے آج بھی موجود ہے۔ یہ اس ملک کے بحری ساز و سامان کی نمائشی اشیا میں سے ایک ہے جن سے لوگ مرعوب ہوتے ہیں۔

اِروِن کی ابتدائی تعلیم ہیمبرگ میں ہوئی تھی اور ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ بھی انجینئر بنیں اور ان کے پھلتے پھولتے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں، جس طرح کی اِروِن کے چھوٹے بھائی نے کیا تھا۔ نوجوان اِروِن کے ایسے ارادے نہیں تھے۔ ابتدا ہی سے اُسے ہیمبرگ کی بندرگاہ اور اس سے متعلق ہر شے میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا، وہ دور تک پیدل چل کر بحری جہازوں کو سامان اتارتے اور سوار کرتے اور دور دراز کی بندرگاہوں کی طرف روانہ ہوتے دیکھنے جاتا تھا۔ ہیمبرگ، جس کو اپنی انگریزی وضع قطع اور اندازِ گفتگو کے لیے اکثر طعنہ دیا جاتا تھا، جرمنی کے حوالے سے دنیا کا دروازہ کہا جاتا تھا۔ یہ شہر تجارت، لین دین اور روایتی طور پر بینکنگ اور بیمے کے کاروبار کے حوالے سے ملک کا تجارتی مرکز تھا۔ جنگ اور اس سے ہونے والی ہول ناک تباہیاں، بھوک، بے روزگاری وغیرہ ایسے نشانات تھے جو بچپنے اور نوجوانی ہی میں اِروِن کے ذہن پر ثبت ہو چکے تھے۔ بڑی مشکلوں سے اس کا باپ اس کو زیرِ تربیت افسر کے طور پر جرمنی کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی اَلیانز مین ملازمت دلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ کمپنی والوں نے اس کو ہر قسم کے بیمے کی جامع تربیت دی جو تین برس پر محیط تھی۔ تربیت کے اختتام پر اِروِن نے ہیمبرگ کے چیمبر آف ٹریڈ کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی جو برطانیہ کے انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اِروِن اپنے کام سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا اور اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کو Börsenabteilung میں تعینات کیا گیا ہے، اس لیے یہ شعبہ ہیمبرگ انشورنس ایکس چینج کے روزانہ کے اجلاس میں براہ راست نمائندگی کے ذریعے کام کرتا تھا۔ یہ ایکس چینج، جس کو Börse'as کے نام سے پکارا جاتا تھا، لندن کے مشہور ادارے لائیڈز Lloyds کے مماثل تھا مگر چھوٹے پیمانے پر اور یہ صرف قومی لین دین تلک محدود تھا۔ وہاں اَلیانز کا ایک بکس رکھا ہوتا اِروِن کے لیے جس میں بروکروں کی جانب سے جمع کیے گئے آرڈر نکال کر اپنے مرکزی دفتر بھیجا کرتا تھا۔ زیادہ تر کاروبار ہیمبرگ کے صنعتی اور تجارتی اداروں کا اور جہاز راں اداروں کا ہوتا تھا۔ اِروِن اس وقت ایک

نوجوان لڑکا تھا اور اس نے کئی بار مجھے بتایا کہ اس نے کتنا فخر محسوس کیا تھا جب اس کو کمپنی کے نمائندے کی حیثیت میں پہننے کو ایکس چینج کا بلاّ (badge) دیا گیا تھا۔ ایکس چینج اس کے لیے اس وقت تک دنیا کی طرف کھلنے والے دروازے کے مماثل تھا جب ۱۹۳۰ء میں تھائی لینڈ میں مقیم جرمنی کے ایک ادارے کو ایک کارکن کی ضرورت ہوئی اور اس نے اَلیانز کے صدر دفتر سے ایک نوجوان، آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے مہم جو نوجوان کے بھرتی کرنے میں مدد کی درخواست کی تھی۔ درخواست گزاروں کی فہرست طویل تھی مگر اِروِن خوش قسمت نکلا۔ جس وقت جرمنی کی ہَنسا لائنز (Hansa Lines) کا ایک بحری جہاز ہیمبرگ سے بنکاک کے لیے روانہ ہوا، اِروِن اس پر سوار تھا اور بے حد خوش تھا۔

اس وقت اس کی عمر صرف تئیس برس تھی اور اس کا ذہن بہت سارے خوابوں اور بہت سارے تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت وجیہ اور دراز قد نوجوان اور نو آبادیاتی زندگی کا دلدادہ یورپی کنوارا تھا۔ اروِن اپنی ملازمت سے بہت خوش تھا اور اس کو اس بات میں قطعی کوئی شک نہیں تھا کہ ایک تاب ناک مستقبل اس کا منتظر تھا۔ اپنی شخصیت کی کشش اور لوگوں سے گھل مل جانے کے فطری انداز کی بنا پر بہت جلد ہی وہ بنکاک کی سوسائٹی کا پسندیدہ نوجوان بن گیا تھا۔

جنسِ مخالف کے سلسلے میں اس کی کم زوری مردوں کے کلب کے بار اور خواتین کی برِج اور چائے کی پارٹیوں میں گفتگو کے لیے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک موضوع تھا۔ گفتگو کے اعتبار سے وہ ایک مشہور کنوارا نوجوان تھا اور ہمیں اس وقت بہت افسوس ہوا جب ہم نے اس کو ایک پُرکشش جرمن خاتون سے شادی کرتے دیکھا جس کے بطن سے ۱۹۳۷ء میں اس کی اکلوتی بیٹی بار برا تولد ہوئی تھی۔

اس وقت تک اِروِن تبدیل ہو کر برما کے شہر رنگون چلا گیا تھا۔ اَلیانز وہاں اپنا ایک نمائندہ بھیجنے کا خواہش مند تھا، اس کو یہ ملازمت پیش کی گئی جو اس نے قبول کر لی۔ اس ملازمت میں بھی اِروِن نے زبردست کامیابی حاصل کر لی، اتنی کہ جرمن حکومت نے اس کو وہاں جرمنی کا اعزازی قونصل مقرر کر دیا۔ اس کی بہت ساری خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ نہ صرف وہاں مقیم یورپی باشندوں میں گھل مل گیا تھا بلکہ بالخصوص مقامی کاروباری حلقے میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ وہاں قیام کے دوران جن خاندانوں سے اس کے دوستانہ روابط استوار ہو گئے تھے، ان میں اصفہانی خاندان شامل تھا جو کلکتے کے بڑے تاجر تھے اور کاروباری حلقوں میں جن کے قریبی رابطے تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہ رشتہ اروِن کی کاروباری زندگی پر خاص انداز میں اثر پذیر ہوا۔

اگست ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور رنگون میں مقیم تمام جرمنوں کو قید کیا جانا تھا۔ اپنے سفارتی منصب کی بنا پر اروِن اور اس کے اہلِ خانہ کو اس وقت تک اپنی جائے قیام میں رہنے دیا گیا جب تک کہ برطانوی اور جرمنی میں مقیم برمی سفارت کاروں کے جوابی تبادلے کا انتظام نہیں ہو گیا تھا۔ مقامی افسران سے اپنے قریبی روابط کی بنا پر اروِن نے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ وہاں مقیم دوسرے گیارہ جرمن افراد کے لیے بھی اس وقت تک اپنے ساتھ رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی جب تک کہ وہ جرمنی لیے کے روانہ نہیں ہو جاتا۔

جرمنی پہنچتے ہی اس کو فوج میں جبری بھرتی کر لیا گیا۔ اپنے پیشہ ورانہ ماضی کی وجہ سے اس کو ایک خاص یونٹ سے منسلک کر دیا گیا جس میں ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والے مشہور رہنما سبھاش چندر بوس کے پیروکار شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاڑھی بڑھا کر چالیس سالہ بنگالی سبھاش چندر بوس جنوری ۱۹۴۱ء کی ایک اندھیری رات میں ایک مسلمان دیہاتی کا بھیس بدل کر ہندوستان سے فرار ہو کر جرمنی پہنچ گیا تھا جہاں اس کو برلن میں ایک پُرتعیش مکان اور سفارتی سطح کے برابر رتبہ دے دیا گیا تھا۔ وہ دو برس تک وہیں مقیم رہا جب تک کہ یہ واضح نہیں ہو گیا تھا کہ جس نوعیت کی پشت پناہی کا وہ طلب گار تھا اس کو فراہم نہیں کی جا سکے گی۔ اڈولف ہٹلر سے خفیہ ملاقات کے بعد اس کو ایک آبدوز کے ذریعے ۱۹۴۳ء کے اوائل میں جاپان پہنچا دیا گیا تھا جہاں انڈین نیشنل آرمی میں مشرقِ بعید سے قید ہونے والے ہندوستانی فوجیوں کی بھرتی کے لیے امداد دی گئی تھی۔ بہر حال یہ ایک بالکل ہی مختلف، مگر دل چسپ، موضوع ہے جس کا میرے دوست کی زندگی سے

کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ ہندوستانیوں پر مبنی اس خاص قسم کے یونٹ سے اس کی وابستگی کی بنا پر جنگ کے اختتام پر فرانسیسیوں نے اسے قید کرلیا تھا۔ اس پر کچھ الزامات بھی لگائے گئے، اس کا کورٹ مارشل ہوا، موت کی سزا بھی سنادی گئی تھی مگر خوش قسمتی سے اس کی اصل حقیقت واضح ہوگئی اور سزا کالعدم کر دی گئی۔

بیگم آئیون اور ان کی بیٹی بار برا اس وقت ہیمبرگ چھوڑ کر Silesia چلے گئے جو بعد میں پولینڈ کا حصہ بن گیا، جب یہ شہر اتحادی فوجوں کی بمباری کا نشانہ بن گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جب شکست نظر آرہی تھی اور سوویت افواج تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں، یہ خاندان ایک بار پھر فرار ہوکر میونخ کے ایک گاؤں میں اِرون کی بہن کے گھر منتقل ہوگیا اور اس کا انتظار کرنے لگا، جس کا نام ان دنوں کی خوف ناک اصطلاح میں 'غائب' ہونے والے افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ بعد میں فرانس میں اس کی قید کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ۱۹۴۸ء میں گھر واپس ہوا۔ سب لوگ ہیمبرگ واپس ہوگئے جہاں اَلیانز نے اِرون کو ایک مقامی شاخ میں ملازمت دے دی۔ جیسا کہ میں کہیں بیان کر چکا ہوں، ان کا غیر ملکی کاروبار بالکل ٹھپ ہوگیا تھا اور 'غیر ملکی' شعبے کے تمام افراد ان کے دوسرے اداروں میں کھپا دیے گئے تھے۔ ان کے سابق کارکن ساتھی ہائنیز شوارز بیمے کی صنعت ہی کو چھوڑ چکے تھے۔

جب اِرون اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو دوبارہ استوار کرنے کی کوشش میں مشغول تھا، اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اس کے پرانے دوست اصفہانی دو برس سے اس کی تلاش میں تھے۔ وہ کلکتے میں قائم اپنی مخلوط بیمہ کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کے لیے ایک غیر برطانوی انشورنس افسر کی تلاش میں تھے جس کا چیف ایگزیکیٹو نیوزی لینڈ کا شہری ٹام بیکسٹر تھا اور اس کی اہلیہ کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا۔ بیکسٹر ۱۹۳۹ء سے ای ایف یو میں تھا، جنرل منیجر بننے سے قبل وہ کمپنی کا سیکریٹری اور انڈر رائیٹر رہ چکا تھا۔ جیسا کہ میں مختلف لوگوں کی اور خود اپنے مربّی اِرون آئیون کی زبانی سن چکا تھا کہ ٹام بیکسٹر انشورنس کا ایک قابل، نہایت اچھے تکنیکی پس منظر کا ماہر پیشہ ور تھا، جسے بازار کے حالات سے اچھی واقفیت تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کمپنی کی سیلز فورس سے اس کے اچھے تعلقات رہتے تھے۔ وہ بھی ایک روایتی نوآبادیاتی غیر ملکی تھا کمپنی سے جس کا تعلق ایک معینہ مدّت کے لیے تھا۔ بنیادی طور پر اس کی سوچ اور اس کے اعمال کمپنی سے اس کے، تین سالہ، معاہدے کے زیرِ اثر ہوتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تین برس سے طویل مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کرتا تھا۔ اس میں اس کی ذاتی زندگی اور کمپنی کا مستقبل، دونوں شامل ہوتے تھے۔

کمپنی کے مفادات کی بات کی طرف واپس آتے ہوئے، یہ کہنا ضروری ہوگا کہ ۴۸-۱۹۴۷ء تک مختلف وجوہات کی بنا پر کمپنی کے ڈائریکٹرز میں اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔ سب سے اہم فیصلہ یہ کرنا تھا، آیا کمپنی کا صدر دفتر کلکتے میں ہی رہے اور اس طرح ہندوستان کا انتخاب کیا جائے یا اسے کراچی تبدیل کر دیا جائے یعنی پاکستان ہجرت کی جائے۔ چیئر مین عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی خاندان نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر پاکستان کا انتخاب کرنا چاہا جب کہ ٹام بیکسٹر چاہتا تھا کہ جیسا ہے ویسا ہی چھوڑ دیا جائے اور ایک بڑی مارکٹ کے امکانات کا انتخاب کیا جائے۔ اور جس کی توقع تھی، کمپنی کی بنیاد رکھنے والوں اور اصفہانی خاندان کے سیاسی پس منظر کے پیشِ نظر پاکستانی ٹولہ حاوی رہا اور اصفہانی خاندان کو اپنا پرانا دوست آئیون ہیمبرگ میں مل گیا۔ آئیون کو بہت خوشی بھی ہوئی اور تامّل بھی۔ تامّل اس لیے کہ اَلیانز نے اسے ایک ایسی جگہ دے دی تھی جو جرمنی کے ان دنوں کے حالات کے پیشِ نظر اس کے ساتھ بڑا احسان تھا۔ مسرور اس لیے کہ وہ اس سے بہتر خواب کی توقع نہیں کر سکتا تھا، کہ اس کے دوست اسے اچھی پیش کش کر رہے تھے۔ مشرق کی زندگی سے اس کی محبت اور لگاؤ کی فتح ہوئی، اس نے یہ پیش کش قبول کر لی، یہ سمجھتے ہوئے کہ جرمنی چھوڑنے کے لیے کاغذی کارروائی میں زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک سال کا عرصہ لگ سکتا تھا جو ان حالات میں عام تھا۔ مگر اصفہانی خاندان نے ڈوریاں ہلائیں اور آئیون کے استعجاب کی انتہا نہ رہی جب تین ماہ کے اندر تمام کاغذی کارروائی مکمل ہوگئی اور ۱۹۴۹ء وہ ہیمبرگ سے پھر روانہ ہوا۔ اس بار کلکتے کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ ہوا اور ٹام بیکسٹر کے نائب،

ڈپٹی جنرل منیجر کی حیثیت سے، ایسٹرن فیڈرل یونین میں شامل ہو گیا۔

ای ایف یو کا صدر دفتر ان دنوں ۳۲ رڈلہوزی اسکوائر ساؤتھ میں تھا۔ عمارت کا نام اسٹینڈرڈ بلڈنگ تھا۔ یہ عمارت اب بھی موجود ہے اور اس میں بنگال واٹر اتھارٹی کا دفتر ہے۔ میں اور میری بیوی ای ایف یو کی جڑوں کی تلاش میں ۱۹۹۸ء میں کلکتے گئے اور محمد چودھری کی، جو تقسیم ہند سے چند دن قبل ای ایف یو میں ملازم ہوئے تھے، بتائی ہوئی تفصیلات کے مطابق ہم نے اس عمارت کو تلاش کرلیا۔ عمارت، دوسری قریبی عمارتوں کی طرح، کچھ خستہ حالت میں تھی مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ علاقہ اہم کاروبار کا مرکز رہا ہوگا۔ عمارت کا اندرون بالکل اسی طرح کا لگا گویا چیئر مین صدیقی صاحب اور ان کے ساتھی اس جاذبِ نظر ہال سے گزر کر موجودہ چیف کے کمرے میں داخل ہوں گے جہاں ایک خلیق افسر نے غیر متوقع طور پر جرمنی سے آئے ہوئے اجنبی مہمانوں کے لیے چائے کا انتظام کیا تھا۔ دیواروں پر نصب چوبی تختے اسی حالت میں نظر آتے تھے جیسے کہ اس وقت رہے ہوں گے جب اِروِن آئیون پہلی بار اس میں داخل ہوا ہوگا۔ خوندکر فضلِ حیدر کے بیٹے مصطفیٰ حیدر ازراہِ مہربانی اپنے ساتھ جناب ہارون رشید کو مجھ سے ملانے ہوٹل میں لے آئے تھے جو آج کل بنگلہ دیش میں ایک بڑے افسر ہیں، ان دنوں بیمہ زندگی کے شعبے میں کام کرتے تھے جب اِروِن کلکتے پہنچے تھے۔

رشید نے کہا ''میں اس ادارے میں یکم مئی ۱۹۴۸ء میں شامل ہوا تھا۔ اس کا صدر دفتر کلکتے میں تھا مگر رجسٹرڈ آفس چاٹگام، مشرقی پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ کلکتے سے ہندوستان، پاکستان اور سیلون میں کمپنی کا سارا کاروبار چلایا جاتا تھا۔ کلکتے میں کمپنی کا یہ دوسرا دفتر تھا۔ پہلا ۹ر کلائیو روڈ پر واقع تھا۔ دونوں دفاتر کلکتے کے تجارتی مرکز میں تھے۔ ڈلہوزی ہندوستان میں ایک برطانوی وائسرائے کا نام تھا۔ تمام بڑے بینک اور بیمہ کمپنیاں وہیں ہوا کرتی تھیں۔ ڈلہوزی اسکوائر کے بیچوں بیچ پانی کی ایک بڑی ٹنکی تھی (جو آج بھی ہے) جس کے اطراف تمام بڑی عمارتیں تھیں۔ جب میں مئی ۱۹۴۸ء میں ملازم ہوا تھا مشہور بنگالی سیاست داں جناب عبدالرحمٰن صدیقی، جو کلکتے کے میئر رہ چکے تھے، کمپنی کے چیئر مین اور ٹامس بیکسٹر جنرل منیجر تھے۔ کئی برس بعد فائر ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بننے والے مقبول انصاری ان دنوں کمپنی کے انڈر رائٹر تھے۔ مسٹر بیکسٹر کو لوگ 'نیوزی لینڈ کی لومڑی' کہا کرتے تھے۔ انشورنس کے آدمی کی حیثیت میں وہ بہت چالاک اور مضبوط آدمی تھے۔ وہ ذہین، عقلمند اور عیار آدمی تھے۔ کمپنی سے ان کا پانچ برس کا معاہدہ تھا۔ جب میں ملازم ہوا اس وقت ان کے معاہدے کا دوسرا دور چل رہا تھا۔ مگر مسٹر آئیون زیادہ مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ جرمن مزاج کے باعث ایک وقت میں کئی چیزوں پر نظر رکھنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔ وہ جب وہاں نہیں بھی ہوتے تھے، ہمیں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک طرح سے قدرتِ کاملہ جیسی صفات رکھتے تھے۔ زیادہ تر ملازمین ان کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ محنت سے کام کرنے پر اُکساتے تھے۔ وہ رتبے کے اعتبار سے ڈپٹی جنرل منیجر تھے مگر درحقیقت وہ کہیں زیادہ طاقتور تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بیکسٹر جیسے لوگ اتنی عجلت میں کمپنی کے دفاتر کلکتے سے کراچی منتقل کرنے کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں، اس میں ان کے ذاتی مفادات بھی تھے۔ شاید مرزا احمد اصفہانی صاحب نے مسٹر آئیون کو معاملات تیزی سے نمٹانے کی غرض سے بلایا تھا۔ اس لیے کہ دفتر کی منتقلی اس وقت ہوئی جب مسٹر آئیون آچکے تھے۔ مجھے یہ سب اچھی طرح معلوم تھا اس لیے کہ میں ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ مسٹر آئیون ہی اصل محرک تھے۔ کمپنی کا دفتر یکم مئی ۱۹۵۰ء میں منتقل ہوا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی منتقل ہو گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جناب وصال الدین اپنے تمام بھائیوں، صلاح الدین، جمال الدین اور رسال الدین کے ساتھ لائف ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ ہم سب ان کو 'بڑا ٹولہ' کہتے تھے۔ ان کے والد جو ایک بارسوخ ایجنٹ تھے وہ بھی ان میں شامل تھے مگر ایک چھتری کی طرح۔ مگر جلد ہی ایک بڑی جنگ شروع ہو گئی۔ ٹولے کے سب سے بڑے بھائی وصال الدین بڑے مہم جو انسان تھے اور ان کی نظریں کمپنی کے سب سے بڑے عہدے پر تھیں۔ اس لیے انھیں حیدر صاحب سے جنگ کرنی تھی جو ۱۹۵۱ء میں جنرل منیجر بن گئے تھے۔ وصال صاحب نے حیدر صاحب کو سخت قسم کے خطوط لکھنے شروع کردیے اور دھمکیاں دیں کہ اگر ان کو

راستہ نہ دیا گیا تو اپنے سب بھائیوں کے ساتھ کمپنی سے علیحدہ ہوجائیں گے۔ اس وقت بھی اپنی تمام تر قوتِ ارادی اور مضبوط ارادوں والے مسٹر آئیون ہی کام آئے۔ وہ ڈھونڈ کر مسٹر خدا بخش کو لے آئے اور انھیں کمپنی میں شامل ہوجانے پر راضی کرلیا۔ اس طرح وصال الدین صاحب کی دھمکیاں کم زور پڑگئیں اور بالآخر وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی، اس لیے کہ مسٹر آئیون نے ان سے بہتر آدمی تلاش کرلیا تھا۔ مسٹر آئیون کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ جب وہ میونخ ری میں ملازم ہوگئے تھے تو اپنے کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے اکثر مشرقی پاکستان آیا کرتے تھے۔ اس دوران میرا تبادلہ یہاں ہوگیا تھا اس لیے کہ میں پیدائشی بنگالی تھا۔ مسٹر آئیون کو اس ملک اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ مجھے ان سے بہت ہم دردی تھی اور دل میں ان کا احترام بھی تھا۔ ای ایف یو کے افسران میں وہ سب سے زیادہ سے بڑے تھے، بڑے اس لیے کہ نہیں کہ دراز قد تھے۔ بڑے وہ اپنی پیشہ ورانہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے تھے۔ اور وہاں ایک اور جرمن صاحب تھے، مسٹر شوارز۔ کمپنی کے بیشتر ملازمین ان کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ اگر چہ میرا ان سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا تھا مگر مجھے جنرل ڈپارٹمنٹ کے ملازمین پر رشک آتا تھا کہ ان جیسا نفیس انسان ان کا افسر تھا۔ مسٹر آئیون اور وہ دونوں ملازمین کا بہت خیال رکھتے تھے اور سب واقعی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ مسٹر آئیون کا سب سے بڑا کارنامہ خدا بخش کی تلاش تھی۔ وہ انشورنس کے بڑے کامیاب کارکن تھے اور انھوں نے ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ میں نئی روح پھونک دی تھی۔"

آج کل ڈلہوزی اسکوائر تین بنگالی شہیدوں، 'بنائے'، 'بادل' اور 'دینیش' کی یاد میں BBD Bagh کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ Writer's Building کے بعد نیتا جی سبھاش روڈ پر آگے چل کر آتا ہے جہاں اس مشہور قومی ہیرو کی مورتی نصب ہے۔ مجھے اپنے دوست اور مربّی کے بارے میں ان الفاظ کو سن کر بہت مسرت ہوئی تھی اور کچھ فخر بھی ہوا تھا۔ سبھاش بوس کے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ اس شخصیت اور میرے دوست کے درمیان کتنا قریبی رشتہ تھا جس سے قریبی رابطے کے شبہے میں میرے دوست کی جان جاتے جاتے بچی تھی جوان ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور خوش ہوتا کہ نہ صرف یہ کہ اس کی جان بچ گئی تھی بلکہ وہ دنیا کے اس خطے میں واپس بھی آگیا تھا جو اس کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ مجھے یقین ہے، اروِن دل ہی دل میں اس بڑے سے مجسمے کی طرف دیکھ کر مسکرایا ہوگا جس کی عزّت سارے ہندوستان میں بڑی بلندیوں پر تھی خواہ وہ تاریخ میں مناسب سیاسی اور سماجی تبدیلیوں ہی سے حاصل کی گئی ہو۔ اس موقعے پر مجھے ایک آدمی کی کہانی یاد آتی ہے جو بہت مختلف وجوہ کی بنا پر شہرت کی اعلیٰ بلندیوں تک پہنچ گیا تھا، میرے شہر ہیمبرگ کا ایک معروف آدمی۔ اس کا نام Störtebecker ہے اور اپنے دوست کا خاکہ مکمل کرنے سے پہلے اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

پانچویں عشرے کے کراچی کی زندگی مشکل، رنگین اور حیرت انگیز تھی، میں ای ایف یو کی تاریخ سے منسلک دوسری عظیم شخصیتوں کے خاکوں میں جس کا زیادہ تفصیل سے تذکرہ کر چکا ہوں۔ شہر میں ہوٹلوں کی کمی کی وجہ سے اروِن نے کئی ماہ فوجیوں کے خیموں میں گزارے۔ یہ خیمے زیرِ تعمیر بیچ لگژری ہوٹل کے مالکوں نے اپنی زمین کے سامنے لگوادیے تھے۔ اروِن اور ان کی اہلیہ اس زمانے کو کبھی نہیں بھولے جب ان کو خیمے کی زندگی سے برسٹل ہوٹل بھیجے جانے پر یک گونہ خوشی ہوئی تھی۔ برسٹل ہوٹل پرانا تھا مگر یقیناً خیموں میں موجود سہولیات سے بہتر رہا ہوگا۔

ایروِن ایک مضبوط اعصاب رکھنے والے افسر تھے۔ ٹام بیکسٹر کے دور میں بھی مگر حیدر صاحب کے زمانے میں، جو ۱۹۵۲ء میں بیکسٹر کی جگہ جنرل منیجر بنادیے گئے تھے، ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ اس لیے اور بھی قابلِ تعریف تھا کہ حیدر صاحب انشورنس کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ نواب بھوپال کے قریبی معتمد اور طویل عرصے تک ریاست کے وزیرِ مالیات ہونے کی وجہ سے وہ ایک با رسوخ سیاسی شخصیت تھے۔ ای ایف یو کے حصے داروں میں سب سے بڑے حصے دار اصفہانی خاندان سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے مگر تکنیکی معاملات میں وہ اپنے نائب اور کمپنی کے اعلیٰ افسران پر اعتبار کرتے تھے۔

کمپنی کے ایک سابق اعلیٰ افسر جناب آغا ناصر علی سے، جو بعد میں اسٹیٹ لائف کارپوریشن کے ڈائریکٹر کے عہدے سے فارغ

ہوئے ہیں، کراچی جیم خانہ میں میری ملاقات ہوئی اور پرانے وقتوں کی باتیں ہوئیں۔ جب ہم اور وہ دونوں ایسٹرن فیڈرل میں کام کر رہے تھے، وہ لائل پور میں برانچ منیجر اور میں صدر دفتر میں تھا۔ انھوں نے فرمایا، ''بسا اوقات آپ ایک انسان سے ملتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں اس کا ایک تاثر قائم ہو جاتا ہے جو زندگی بھر نہیں جاتا۔ مسٹر آئیون کے سلسلے میں میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ایسے انسان تھے جو ہر شخص کو متاثر کر سکتے تھے۔ آپ انھیں کسی گاہک سے ملاقات کے لیے لے جائیے تو آپ کو واقعتاً خوشی ہو گی کہ آپ نے ایسا کیا۔ ان سے انکار کرنا بہت مشکل بات تھی۔ وہ بڑی اعلیٰ درجے کی شخصیت کے مالک تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ای ایف یو بڑی خوش قسمت تھی کہ حیدر صاحب سیاسی اعتبار سے محترم اور بارسوخ آدمی تھے اور ان کی تکنیکی صلاحیتوں کی کمی پوری کرنے کے لیے ان کو آئیون جیسا مددگار مل گیا تھا۔ چند دن قبل ہی جب کمپنی کو مشکلات سے نکالنے کے لیے مسٹر آئیون لندن آئے تو میں لندن ہی میں تھا جہاں مجھے تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اگر مسٹر آئیون نہ ہوتے تو ای ایف یو کی مشکلات اور بڑھ جاتیں۔ حیدر صاحب ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور یہی وجہ تھی کہ حیدر صاحب ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ جی ہاں، مسٹر آئیون بہت بڑے آدمی تھے، صرف جسمانی اعتبار ہی سے نہیں۔ ایک عظیم شخصیت، صرف انشورنس ہی میں نہیں، پوری مارکیٹ میں ان کو اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چند لمحے ان سے بات کر کے ہی ان کی عظمت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جو بھی ان سے قربت رکھتا تھا وہ ان کی ایک خصوصیت کو کبھی نہیں بھول سکتا، میرے خدا! وہ ہمارے کھانوں کے دیوانے تھے۔ وہ اس قسم کے کھانے بھی کھا سکتے تھے مجھے جن کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بڑی بڑی ہری مرچیں انھیں بہت مرغوب تھیں۔ وہ پلیٹ بھر ہری مرچیں کھا بھی سکتے تھے۔ وہ بسیار خور تھے اور ان کو کھاتے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھانے سے لطف اندوز بھی ہو رہے ہیں۔ اور بلاشبہ، وہ کسی بھی مقدار میں وہسکی پی سکتے تھے۔ کیا خوب انسان تھے وہ!''

اِروِن آئیون ایسٹرن فیڈرل یونین اور اس مستقبل میں ہونے والی ترقی پر اپنے نشانات چھوڑ گئے تھے۔ وہ لندن مسئلے کو حل تو نہیں کر سکے تھے مگر ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ان کی وجہ سے ہی بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اس مشکل کا صحیح ادراک ہوا تھا۔ یہی دوسری عالمی جنگ سے قبل کے الیانز کے اپنے پرانے ساتھی مسٹر ہائینز شوارز کو لے آئے تھے جن کی وجہ سے کمپنی کو تکنیکی اور انتظامی صلاحیتیں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ اور انھی کی بدولت لندن کے بروکروں کے بدلے دنیا کی سب سے بڑی ری انشورنش کمپنی، میونخ ری سے ای ایف یو کے رشتے استوار ہو گئے جو کمپنی کی مالیاتی نجات دہندہ بن کر سامنے آئی۔

اِروِن ۱۹۵۵ء میں ای ایف یو چھوڑ کر میونخ ری میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے اور ۱۹۷۲ء تک وہیں کام کرتے رہے۔ میونخ ری میں ملازمت کے دوران ان کو کئی مہماتی ذمے داریوں کے ساتھ جنوبی افریقا اور ایران بھیجا گیا اور ہانگ کانگ میں کمپنی کے دفتر کی بنیاد رکھنے کے لیے جوان جیسے تجربے کار اور باصلاحیت انسان کے لیے حیرت انگیز کام تھا۔ ہانگ کانگ میں میونخ ری کا قیام بہت کامیاب رہا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اِروِن آئیون میرے اتالیق کے مانند تھا اس لیے کہ وہی تھا جس نے مجھے ہیمبرگ سے ڈھونڈ نکالا تھا جب اس کی کمپنی، ای ایف یو کو ہائنز شوارز کا مناسب نعم البدل درکار تھا، جس کا ایک الگ خاکہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ تفاوتِ عمری کے باوجود ہمارا رشتہ دوستی سے کچھ زیادہ تھا۔ ہمارے تعلقات خاندانی نوعیت کے ہو گئے تھے اور یہ مارچ ۱۹۹۰ء تک قائم رہے تھے۔

آج بھی ایشیا کے بہت سے حصوں میں، بشمول پاکستان، ان کو ایک باصلاحیت انسان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ جس منظر میں بھی وہ ابھرتے اس پر چھا جاتے تھے۔ صرف اپنی درازقدی اور متاثر کن بُشرے ہی کی وجہ سے نہیں، وہ دعوتوں میں، خواہ میونخ ہو یا کراچی، منیلا ہو یا تائپہ، یا ہانگ کانگ وہ جس محفل میں ہوتے حاضرین کو محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بے شمار حیرت انگیز واقعات ان کے حافظے میں محفوظ تھے، اصلی بھی اور تصوراتی بھی۔ بڑی توانائی تھی اُن میں۔ دیر تک تھکا دینے والے رتجگے کے باوجود بھی وہ علی الصباح تر و تازہ نظر آتے تھے۔

کچھ دوستوں کے نزدیک، اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اُن کو سخت گیر اور انا پرست سمجھتے تھے، وہ 'Hanseatic League کے معروف کردار Klaus Störtebeker کی مانند تھے۔ Störtebeker ان رہنماؤں کے جتھے میں سے تھا جن کو چودھویں صدی کے اواخر میں Vitalien Brotherhood کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جتھا بحری تجار پر مشتمل تھا جس نے ۱۳۸۹ء سے ۱۳۹۵ء تک اسٹاک ہوم کے محاصرے کے دوران شہریوں کو خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کی تھیں اور اپنی سیاسی مہم کے اختتام پر آخر میں سمندری قزاق بن گیا تھا۔ بڑے کامیاب تھے یہ لوگ، انگلستان کے کردار 'رابن ہڈ' کی طرح جو اپنی لوٹی ہوئی اشیا کا ایک حصہ غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شمالی 'لیگ' نے اپنے منتخب کپتانوں کو ان کی گرفتاری پر مامور کیا، ان کو پکڑا گیا اور ہمبرگ میں عوام کے سامنے، بھرے بازار میں Störtebeker اور اس کے ساتھیوں کے سر قلم کر دیے گئے تھے۔ سر قلم کرنے سے پہلے جب جلّاد نے حسبِ دستور Störtebeker سے اس کی آخری خواہش پوچھی تو اس نے کہا، ''میرے تمام ساتھیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دو جس میں پہلا شخص میں ہوں۔ اور جب میرا سر قلم کر دیا جائے تو قطار میں موجود جن لوگوں کے سامنے تک میں بغیر سر کے چل سکوں، ان کو معاف کر دیا جائے۔ داستان کے مطابق سر قلم ہونے کے بعد بھی Störtebeker قطار میں کھڑے سات افراد کے سامنے تک بغیر سر کے چلتا گیا۔ ان سات افراد کو معاف کر دیا گیا۔

میں نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ اروِن سی آئیون کو داستان کے اس کردار کے مماثل قرار دینا اچھا لگے گا، ہیمبرگ کے بزرگ اپنے ہر بچے کو، کسی نہ کسی مرحلے پر جس کی داستان ضرور سناتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کو یہ خبر رہی ہوگی کہ کچھ لوگ اس کو اس خوب صورت کہانی کے مشہور ترین کردار جیسا سمجھتے تھے۔ یقیناً وہ اس کو سُن لیتا تو خوش ہوتا۔

خدا بخش

ای ایف یولائف کے تین عظیم نمائندے جناب عالم، ڈاکٹر سعید خان، جناب خدا بخش